دسمبر ۱۹۵۷ء

رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۴۰

ربیع الاول ۳۷۷ ھ

جلد ۴۹ عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک ، اچھرہ - لاہور پاکستان

قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

چندہ سالانہ ۶ روپے

خـــالی صفحـــه

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

نمبر ۳	ربیع الاول ۱۳۷۷ھ - مطابق دسمبر ۱۹۵۷ء	جلد ۴۹

اشارات — ادارہ — ۲

مقالات:

اسلامی حکومت میں ملازموں کے حقوق و فرائض — پروفیسر لبیب السعید مصری — ۱۷

"اپنی اصلاح آپ" — جناب ابو السلام نعیم صدیقی صاحب — ۳۵

رسائل و مسائل:

اسلامی جمہوریت اور مغربی جمہوریت میں فرق — ادارہ

مغرب سے اخلاق کا سبق

مطبوعات

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور
سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

ایک مسلمان جب دعوتِ دین کا پاک اور نیک ارادہ لے کر اٹھتا ہے تو اس کے سامنے سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنی دعوت کا آغاز کس طرح کرے۔ کیا وہ چھوٹتے ہی پہلے مخاطب کو اپنی ساری بات سنا دے اور پھر اسے اعتراضات کا موقع دے، یا پہلے مخاطب کو اپنی الجھنوں اور پریشانیوں کو بیان کرنے کی دعوت دے اور پھر آن کی روشنی میں اس سے تبادلۂ خیالات کیا جائے۔ دعوتِ دین کے لیے نقطۂ آغاز معلوم کرنا ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے دعوت کا کام کرنے والا ہر شخص زندگی میں ایک بار یا چند بار نہیں بلکہ ایک دن میں کئی کئی بار دوچار ہوتا ہے۔ جو لوگ مزدوروں اور کسانوں میں کام کرتے ہیں وہ بھی اس معاملے میں وہی دقت محسوس کرتے ہیں جو علمی کام کرنے والوں کو پیش آتی ہے۔ دعوت کے کسی کارکن کو اس سے مفر نہیں۔ اس کے لیے اگرچہ کوئی لگا بندھا ضابطہ یا طریقہ تو طے نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس مسئلہ کے حل کے لیے کوئی کلیہ ہی بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم آج اس کے متعلق چند بنیادی باتیں عرض کرتے ہیں۔

بعض حضرات کا اس بارے میں یہ خیال ہے کہ جذبہ ہی درحقیقت اس معاملہ میں بہترین رہنما ہے۔ جب ایک شخص کے دل میں کسی نصب العین یا مقصد کے لیے طلب صادق پیدا ہو جاتی ہے تو وہ جدوجہد کی راہیں خود بخود نکال لیتا ہے۔ اس "جذبِ اندروں" میں یہ قدرت اور طاقت موجود ہے کہ وہ نئے نئے طریقوں کی تخلیق کرے اور اپنے عمل کے نتائج پر غور و فکر کر کے ان میں تغیر و تبدل کرتا چلا جائے۔ منزلِ مقصود تک پہنچنے کی آرزو جتنی شدید اور گہری ہو گی راستے کی مشکلات اسی تناسب سے آسان ہوتی چلی جائیں گی۔ لہٰذا اصل ضرورت دعوت کے طریقے

معلوم کرنا نہیں بلکہ دین کے لیے سچا عشق پیدا کرنا ہے۔

ہم دعوتِ دین کے معاملے میں اس بنیادی حقیقت کے خود قائل ہیں اور اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایک آئیڈیل کے ساتھ محبت انسان کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ ہر قسم کے موانع پر خواہ وہ فطری ہوں یا عمرانی، غلبہ پالے۔ ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ یہ جذبہ اپنے اندر ایک لازوال طاقت رکھتا ہے، اور جو اسے اپنائے اس کے اندر بھی یہ قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ تسخیرِ فطرت کی صلاحیت پیدا کر سکے اور راہِ طلب و عمل میں آگے بڑھتا چلا جائے۔ اس بنا پر یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح ہے کہ دعوت کے طریق کا بہترین فیصلہ ایک شخص کا وجدان اور ذوق ہی کر سکتا ہے اور اس معاملے میں ایک لگے بندھے ضابطے یا طریقے کی پابندی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی کچھ کم قابلِ لحاظ نہیں ہے کہ دعوت و تبلیغ کی حکمت سے واقف ہونا اور ان لوگوں کے طریقِ کار سے سبق لینا جو اس سے پہلے یہ کام بہترین طریقے سے کر چکے ہیں، اس وجدان و ذوق کی رہنمائی کے لیے بہت مفید ہے۔ اسی غرض کے لیے ہم آج مختصراً یہ بتائیں گے کہ کسی شخص یا گروہ کے سامنے دعوتِ دین کو ابتداءً پیش کرنے کے لیے کونسا نقطۂ آغاز بالعموم مناسب تر ہوتا ہے۔

آپ اگر اردگرد کی پھیلی ہوئی وسیع دنیا میں آباد انسانوں پر ایک نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہاں ہر شخص مضطرب اور پریشان ہے۔ اگر ایک فرد کو غمِ دوراں ستا رہا ہے تو دوسرا "غمِ جاناں" کے چنگل میں گرفتار ہے۔ اگر ایک شخص معاشی حیثیت سے غیر مطمئن ہے تو دوسرا سیاسی اعتبار سے بے چین۔ اسی طرح اگر ایک فرد کے جسم کے تقاضے پورے ہو رہے ہیں تو اس کی روح ایک تشنگی سی محسوس کرتی ہے۔ الغرض ہم میں سے ہر فرد کسی نہ کسی لحاظ سے پریشان نظر آتا ہے۔

یہ معاملہ صرف ایک فرد تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کی لپیٹ میں بڑے ملک اور بڑی بڑی قومیں تک آجاتی ہیں۔ دنیا کی کئی اقوام غیر ملکی سامراج کے نیچے پس رہی ہیں اور انہیں یہ فکر لاحق ہے

کہ کسی طرح اس لعنت سے نجات حاصل کی جائے۔ دوسری طرف کئی قومیں اس امر کے لیے کوشاں ہیں کہ کسی طرح ان مظلوموں کو زیادہ سے زیادہ مدت تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھا جائے اور اس دوران میں جس قدر ممکن ہو، ان کا خون نچوڑا جائے۔ کسی کو ملک گیری کی ہوس کھائے جا رہی ہے اور کسی کے سر پر ایک عالم گیر جنگ کا خطرہ منڈلا رہا ہے۔

پھر یہ کشمکش صرف قوموں اور ملکوں کے درمیان ہی نہیں بلکہ ہر قوم کے اپنے اندر ایک زبردست ہیجان اور خلجان پایا جاتا ہے۔ ایک طبقہ دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہے۔ اگر ایک قوم کے لوگ ایک طرزِ فکر اختیار کرتے ہیں تو اُس سے عجیب وغریب نوعیت کی پیچیدگیاں پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ اور جب اس کو بدل کر دوسری راہ پر چلتے ہیں تو دوسرے مسائل پریشان کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً جب معیشت کو آزاد کیا جائے تو اس سے ایک گروہ کے لیے ناجائز استحصال کا میدان ہموار ہوتا ہے۔ بیروزگاری بڑھتی ہے اور طبقاتی تقسیم معرضِ وجود میں آتی ہے۔ اس کے برعکس جب پیدائشِ دولت اور تقسیم دولت کو حکومت کی تحویل میں دے دیا جائے تو انسان کو ایک نہایت ہی جابرانہ نظام کی جکڑ بندیاں قبول کرنی پڑتی ہیں جس میں نہ کسی شخص کو ضمیر کی آزادی حاصل ہوتی ہے نہ اظہارِ رائے کی آزادی۔ وہ بیچارا اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ نہ صرف معاشی منصوبہ بندی کے تحت زندگی گذارے، بلکہ اپنے جذبات واحساسات، افکار وتصورات کو بھی ایک بندھے پلان کے مطابق ڈھال لے۔ اور اگر اُس میں ڈھل جانے کی یہ صلاحیت موجود نہ ہو تو یا وہ موت کو دعوت دے یا پھر ساری عمر سائیبریا کے برفانی میدانوں میں دُکھ اور مصیبتیں جھیلتا رہے۔

یہ مضطرب کیفیات اور یہ پریشان کُن حالات جن میں سے ہر فرد گزر رہا ہے اور جنھیں وہ نہایت شدّت سے محسوس بھی کرتا ہے، دعوتِ دین کا بڑی آسانی کے ساتھ نقطۂ آغاز بن سکتی ہیں۔ خواہ کوئی شخص سیاسی حالات سے غیر مطمئن ہو یا معاشی احوال سے یا معاشرتی وتمدّنی کیفیات سے، اسے بغیر کسی دقّت کے یہ بات سمجھائی جا سکتی ہے کہ جس چیز پر وہ مضطرب ہے وہ اصل بگاڑ نہیں ہے

بلکہ ایک کلی اور بنیادی بگاڑ کا محض ایک رُخ ہے۔ جب تک تم مجموعی خرابی کو اور اس کے بنیادی سبب کو نہ سمجھ لو۔ اس کے محض ایک جُزیا چند اجزاء کو بدل دینے میں اوّل تو کامیاب نہیں ہو سکتے اور اگر کامیاب ہو بھی جاؤ تو اس سے وجوہ اضطراب ختم ہوجانے کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔ اس طریقے سے جب آدمی کا ذہن ایک مرتبہ فروعی مظاہر کے الجھاؤ سے نکل کر حقائق کا سراغ لگانے پر آمادہ ہو جائے تو اسے بآسانی اس بنیادی اصلاح کو سمجھنے کے قابل بنایا جا سکتا ہے جو دین حق انسانی زندگی میں کرنا چاہتا ہے اور جس سے زندگی کے ہر شعبے کا بگاڑ درست کیا جا سکتا ہے۔

ہم اپنی اس بات کو چند مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس وقت ملک کی جو معاشی صورتِ حال ہے اُس سے ایک عام اضطراب ہر طرف برپا ہے یہاں دولت کی تقسیم نہ صرف غیر مساوی ہے بلکہ غیر عادلانہ بھی ہے۔ غریب اور متوسط طبقے اشیاء کی روزافزوں گرانی کی وجہ سے بُری طرح پس رہے ہیں۔ ان کے برعکس ایک قلیل گروہ لائسنسوں اور بلیک مارکیٹ جیسے ناجائز طریقوں سے حیرت انگیز سُرعت کے ساتھ امیر ہو رہا ہے۔ چونکہ اس طبقہ کو دولت بغیر کسی محنت اور مشقت کے حاصل ہو رہی ہے اس لیے وہ اسے نہایت بے پروائی سے خرچ کرتا ہے۔ اس کے اس طرزِ عمل سے اس ملک میں عیش و تنعم کی زندگی کی بہت زیادہ حوصلہ افزائی ہوئی ہے اور اس طرح یہاں فحاشی اور بد معاشی کا بازار گرم ہوا ہے۔ لوگ جب اس مسئلہ کو بادی النظر میں دیکھتے ہیں تو ان کو یہ مسئلہ صرف معاشی مسئلہ نظر آتا ہے۔ ایک آدمی فوراً یہ کہہ سکتا ہے کہ اس صورتِ حال کو ہم معاشی پالیسی میں تبدیلی کر کے بدل سکتے ہیں۔ مثلاً اس معاملہ میں وہ آپ کو یہ بتائے گا کہ منافعوں پر بڑھتی ہوئی شرح پر ٹیکس عائد کرنے سے، لائسنس اور پرمٹ اور کوٹا سسٹم کو ختم کرنے سے اور اخراجات پر پابندی لگا دینے سے حالات درست ہو سکتے ہیں۔ آئیے! اب یہ دیکھیں کہ کیا حالات کا یہ صحیح تجزیہ ہے۔ مثلاً اگر منافعوں پر ٹیکس کی شرح بڑھا دیتے ہیں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وصول کرنے والے کارندے ایمانداری سے اس کو وصول کریں، اور ٹیکس

ادا کرنے والے بغیر کسی ہیر پھیر کا طریقہ اختیار کیے پوری دیانتداری سے یہ ٹیکس دے دیں۔ لائسنس اور کوٹا کا جہاں تک تعلق ہے ہم اس وقت کے حالات کے پیش نظر اسے ختم نہیں کر سکتے۔ نہ ہمارے پاس اس قدر زرِ مبادلہ ہے کہ ہم آزاد تجارت کی پالیسی پر عمل پیرا ہو سکیں اور نہ آزاد تجارت کے نتائج بھگتنے کی ہم سکت ہی رکھتے ہیں۔ ہم مجبور ہیں کہ اپنی بیرونی تجارت کو محدود رکھیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم جو کچھ کر سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ جن لوگوں پر لائسنسوں اور کوٹوں کی عنایات کی جا رہی ہیں اُن سے یہ عنایات چھین کر یا تو حکومت خود درآمد کرے یا اس کے لیے موزوں لوگوں کو منتخب کرے۔ اب ہمارے پاس اس امر کی کیا گارنٹی ہے کہ اربابِ حکومت یا وہ دوسرے لوگ اس معاملہ میں بڑی دیانتداری سے کام لیںگے۔ جہاں تک اخراجات پر پابندی عائد کرنے کا سوال ہے اس معاملہ میں بھی خارج سے کوئی حد نہیں لگائی جا سکتی۔ عقل بڑی عیار ہے، سو بھیس بنا لیتی ہے۔ آپ اخراجات کی اگر ایک شکل کو ناجائز قرار دیں گے تو وہ فوراً انھیں دوسری شکل میں ڈھال لے گی۔

ان گزارشات پر اگر آپ غور کریں تو معلوم ہو گا کہ آئین و ضوابط کی تبدیلیاں خواہ بڑی اہم ہی سہی لیکن وہ اس وقت تک کوئی قابلِ قدر نتائج پیدا نہیں کر سکتیں جب تک انسان کے زاویہ ہائے فکر و نگاہ کو نہ بدلا جائے۔ اور یہ معاملہ معاشی نہیں بلکہ اخلاقی ہے، یا دوسرے الفاظ میں خارجی نہیں بلکہ داخلی ہے۔

اب سوال پیدا ہو گا کہ ہم اخلاق کا وہ کونسا ضابطہ اختیار کریں جس سے صورتِ حال میں کوئی صحت مند تبدیلی پیدا ہو۔ ایک تو اخلاق کی وہ شکل ہے جو یورپ کی قوموں میں نظر آتی ہے۔ اس اخلاق کو ہم "مصلحت پرستانہ قومی اخلاق" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں یعنی جس طرزِ عمل میں ملک اور قوم کا فائدہ دکھائی دیا اُسے ہی اخلاقی ضابطہ بنا لیا۔ اخلاق کی یہ قسم معروضی اقدار پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ وہ سیمابی اخلاق ہے جس کی قدریں خارجی حالات کے تبدیل ہونے سے ہر آن محوِ رقص رہتی ہیں۔ ممکن ہے اس اخلاق سے ایک گروہ قوم یا ملک کو وقتی طور پر کچھ نہ کچھ فائدہ حاصل ہو جائے لیکن اس سے انسانیت کی سطح بلند نہیں ہوتی۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انگلستان کے وہ نام نہاد اخلاق پرست جو حریت اور شرفِ انسانیت کا پرچار کرتے ہوئے کبھی نہیں تھکتے وہ جب ہندوستان پر قابض ہوئے تو یہاں خونریزی، سفاکی اور زبردست آزاری کے دیوتا ثابت ہوئے۔ وہ لوگ جو اخلاقِ انسانی کے نوامیسِ عالیہ کی حفاظت اور پاسبانی کے دعویدار تھے انھوں نے استعماری عزائم کے ساتھ یہاں کے لاکھوں، کروڑوں مظلوم بندگانِ خدا کو ہلاک و پامال کر ڈالا۔ ظاہر بات ہے کہ اخلاق کی اس قسم کو کوئی انسان جسے انسانیت کا ذرا بھی پاس ہے، قبول کرنا گوارا نہیں کر سکتا۔ وہ ہمیشہ اُن اخلاقی اقدار کو تسلیم کریگا جو آفاقی ہوں، جو "من و تو" کے ساتھ بدلتی نہ رہیں، جن کے پیچھے پوری نوعِ انسانی کی بلندی کا جذبہ کام کر رہا ہو۔ آپ جب اس معاملہ پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ اخلاق اس وقت تک معرضِ وجود میں نہیں آ سکتا جب تک کہ ایک انسان کائنات اور اُس کے خالق کے ساتھ اپنے رشتہ کا صحیح صحیح تعین نہ کرلے

اس طرح معاشی مسئلہ سے بات شروع کر کے آپ خود بخود اسلام پر پہنچ جاتے ہیں مخاطب کے اضطراب کی تشخیص کر کے اُسے غور و فکر کی صحیح راہ پر ڈال دیجیے پھر ایک کڑی دوسری کڑی سے ملتی چلی جائے گی اور وہ از خود صحیح نتائج اخذ کرے گا۔

اسی طرح وہ لوگ جو سرمایہ دارانہ جمہوریت سے بددل ہو کر اشتراکیت کی طرف جھک جاتے ہیں انھیں بھی تھوڑی سی کوشش سے صحیح راہ پر لگایا جا سکتا ہے۔ اس معاملہ میں سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ اُن کی دُکھتی رگ کیا ہے۔ آپ جب بھی اُن سے بات کریں وہ یہی کہیں گے کہ سرمایہ دارانہ جمہوریت میں چونکہ ہر فرد کو ملکیت کا غیر محدود حق حاصل ہے اور اسے یہ بھی اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنی دولت کو جس طرح چاہے کام میں لگائے یا خرچ کرے، اس لیے معاشی اعتبار سے طاقتور گروہ مفلوک الحال لوگوں کی بے بسی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر انھیں لوٹتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ فساد کی اصل جڑ ان کے نزدیک دولت اور اس سے حاصل ہونے والی طاقت ہے، اسی کے حقوق مالکانہ انسان کو ظالم اور سفاک بنا دیتے ہیں۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر یہ ساری

دولت افراد کے قبضے سے نکال کر قومی ملکیت بنادی جائے تو وہ انسان کہاں سے آئیں گے جو اس مجموعی دولت اور اس سے حاصل ہونے والی طاقت کو انصاف کے ساتھ سب کی بھلائی کے کام میں لگائیں اور اتنی بڑی قوت پاکر ظالم و سفاک نہ بن جائیں ؟ اگر ایسے انسان تیار کرنے کی کوئی سبیل ہے تو اس دولت اور طاقت کے افراد کے پاس رہنے سے بھی کوئی خرابی پیدا نہیں ہوسکتی۔ اور اگر اس کی کوئی سبیل نہیں ہے تو افراد سے چھین کر ساری دولت اور طاقت ایک جگہ سمیٹ دینے سے ظلم ہزاروں گنا زیادہ بڑھ جائے گا، کیونکہ تم خود کہہ رہے ہو کہ یہی دولت اور طاقت انسان کو ظالم بنادیتی ہے۔ اس طرح پھر پھر کر بات وہیں پہنچ جاتی ہے کہ اصل مسئلہ دولت کی انفرادی یا اجتماعی ملکیت کا نہیں ہے بلکہ انسان کے اندر عدل اور حق شناسی اور احساسِ ذمہ داری پیدا کرنے کا ہے اور آخری تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز اس وقت تک صحیح معنوں میں پیدا نہیں ہوسکتی جب تک اس کائنات میں انسان اپنے حقیقی مقام، اور ربِ کائنات کے ساتھ اپنے تعلق کی نوعیت کو ٹھیک ٹھیک نہ جان لے۔

غرض آپ زندگی کے کسی پہلو کا تجزیہ کریں، خواہ اس کا تعلق اخلاق و اجتماع سے ہو یا سیاست و آئین سے، یا نظامِ معیشت سے۔ آخر کار اس کے بگاڑ اور سنوار میں جو سوال مرکزی اہمیت کا حامل نکلے گا وہ یہی ہوگا کہ نظامِ زندگی کے کارکن اور کارفرما انسان کیا سمجھ کر اس زندگی کی گاڑی کو چلا رہے ہیں اور ان کے فکر و عمل کی بنیاد کن تصورات پر ہے۔ سوچنے والا ذہن زندگی کے جس مسئلے میں بھی غلطاں و پیچاں ہو، آپ ایک دفعہ اسے صحیح طریقہ سے اس مسئلے کی طرف متوجہ کردیجیے، پھر وہ اگر متعصب یا ضدی نہیں ہے تو خود اس حقیقت کو پالے گا کہ انسان کے صحیح روش پر چلنے کا انحصار جس چیز پر ہے وہ صرف رب العٰلمین کے ساتھ اس کے تعلق کا درست ہونا ہے۔

دعوت کے اس طریقے میں متعدد خوبیاں ہیں۔ ایک شخص کے اضطراب اور پریشانی کو جب ہم خود محسوس کرتے ہیں اور اس اضطراب میں اس کے شریکِ حال ہو کر بات کرتے ہیں تو اس سے مخاطب کے

دل میں خود بخود یہ احساس پیدا ہونے لگتا ہے کہ دعوت دینے والا صرف واعظ ہی نہیں ہے بلکہ اس کے درد میں اس کے ساتھ شریک ہے۔ وہ یونانی دیوتاؤں کی طرح پہاڑوں پر کھڑے ہو کر نوعِ انسانی کے مصائب پر خندہ زن نہیں ہو رہا ہے۔ وہ ما فوق البشر نہیں ہے بلکہ اسی طرح کا ایک بشر ہے جیسے اور سب بشر ہیں۔ اسے بھی اسی طرح کے مسائل درپیش ہیں جس طرح کہ ایک عام انسان کو ہر روز پیش آتے ہیں۔ وہ بھی اُن کے بارے میں سوچتا ہے، اُن پر غور و فکر کرتا ہے اور انھیں حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب ایک شخص کے بارے میں یہ یقین ہو جائے کہ وہ کسی معاملے میں آپ کا رفیق ہے تو پھر آپ اُس کی بات سننے کے لیے فوراً آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ایک انسان عام طور پر اُن لوگوں سے بھاگتا ہے جو بلندیوں پر بیٹھ کر آپ سے تبادلۂ خیالات کرنا چاہیں۔ لیکن جب آپ یہ ثابت کردیں کہ آپ اس کے بھائی ہیں تو پھر اسے نہ صرف آپ کی بات سننے میں کوئی عذر نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کے لیے ہمہ تن گوش ہو جاتا ہے۔ ہم اُس شخص کی بات پر کبھی کان نہیں دھرتے جس کے بارے میں ہمیں یہ احساس ہو جائے کہ وہ ہم سے اور ہمارے احساسات سے بیگانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنا پیغام فرشتوں کے ذریعے نوعِ انسانی میں نہیں پھیلایا بلکہ اس کام کے لیے نوعِ انسانی ہی میں سے چند بزرگ و برتر افراد کو منتخب کیا جو عام انسانوں میں گھل مل کر رہتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔ وہ شخص جو ہمیشہ عالمِ بالا سے باتیں کرے اور انھیں ہر وقت بس دوسری دنیا ہی کی باتیں سناتا رہے، دعوت کے کام کے لیے موزوں نہیں ہوتا۔ اس کی باتوں کو لوگ عقیدت کے کانوں سے بھی سنیں تو یہ احساس فطرۃً ان کے دل سے نہیں نکل سکتا کہ یہ اللہ والوں کی باتیں ہیں جن کا مقام عام انسانوں سے وراء الورا ہے۔

پھر جب آپ بلا حیل و حجت اس ماحول کی ظلم و زیادتی کو تسلیم کر لیتے ہیں تو اس سے بھی مخاطب پر نہایت اچھا اثر پڑتا ہے۔ وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ آپ کج بحث نہیں ہیں بلکہ ایک مخلص انسان ہیں جو زندگی کے حقائق سے صرفِ نظر کر کے نہیں چلتا۔ بلکہ اس دنیا اور اُس کے مسائل کو آنکھیں کھول کر

دیکھتا ہے۔ آپ کی دعوت صرف الفاظ کی بازیگری نہیں بلکہ اُس کی پشت پناہی ایک گہرا خلوص اور ذاتی تجربہ کر رہا ہے۔ آپ کا مدعا یہ نہیں کہ ذہنی کشتی میں مدمقابل کو نیچا دکھا کر اپنی برتری کا لوہا منوایا جائے بلکہ آپ کا مقصد یہ ہے کہ اُس دکھ درد کا مداوا کرنے کے لیے کچھ کیا جائے جس میں وہ اور آپ اور دوسرے بے شمار انسان گرفتار ہیں۔ لہٰذا آپ اُس کے مخالف نہیں بلکہ اُس کے ساتھی ہیں۔

جب دعوت کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو اس سے داعی کے اندر خود بخود حقیقت پسندی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ پھر خلا میں نہیں سوچتا بلکہ زمان و مکان کی حدبندیوں میں رہ کر حالات و واقعات پر غور کرتا ہے۔ اس کی نگاہیں دوررس اور اس کا نقطۂ نظر وسیع اور آفاقی ہوتا ہے۔ اس لیے اُس کے ذہن میں وہ کشمکش پرورش نہیں پاتی جو عام طور پر ایک تخیل کی دنیا میں بسنے والے انسان کے دماغ میں حقیقت اور خواہش کی باہمی آویزش کی وجہ سے جنم لیتی ہے۔ وہ صرف نصب العین ہی پر نظر نہیں رکھتا بلکہ اس تک پہنچنے کے لیے راستے میں جتنے مراحل سے گزرنا ناگزیر ہوتا ہے اُن پر بھی وہ برابر نگاہ رکھتا ہے۔ اس بنا پر اس کے تجزیہ میں زیادہ صحت پائی جاتی ہے۔

اس کے ساتھ اس طرزِ عمل سے اُس میں رواداری اور صبر و تحمل کی صفات بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ جب اپنے حالات و واقعات کو خواب و خیال کے آئینہ میں نہیں بلکہ حقیقت کی عینک سے دیکھتا ہے تو اُس کے مشاہدہ میں ارضیت اور عصریت کے عناصر پوری طرح شامل ہوتے ہیں اور اس وجہ سے وہ دوسروں کے نقطۂ نظر پر بھی ہمدردانہ غور کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ وہ نہ تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر برہم ہوتا ہے اور نہ ہی جزئیات پر کفر و ایمان کی بحث اٹھاتا ہے۔ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح آشنا ہوتا ہے کہ حالات کے مطالعہ میں ایمانداری اور خلوص کے ساتھ اختلاف رائے بھی ہو سکتا ہے اور اسے برداشت بھی کرنا چاہیے۔ اس لیے اُسے دشمن کو جہنم بھیجنے

سے کہیں زیادہ فکر اس بات کی ہوتی ہے کہ وہ اپنے مخاطب کی اصل پریشانی کو معلوم کرکے اُسے راہِ راست پر لے آئے۔ وہ جانتا ہے کہ ہر وہ تحریک جو خلوص پر مبنی ہو اور جس میں نوعِ انسانی کے مصائب دُور کرنے کا جذبہ کارفرما ہو، اُس میں صداقت کا کم از کم ایک عنصر ضرور پایا جاتا ہے لیکن چونکہ یہ صداقت جزوی ہوتی ہے اس لیے ادھوری سچائیوں کی طرح خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ وہ نہایت دیدہ وری سے اپنے مخاطب کو اس جزوی صداقت سے گذار کر "صداقتِ کُلّی" تک لے جانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں کبھی یہ طریقہ اختیار نہیں کرتا کہ سرے سے اس جزوی صداقت کے وجود ہی کا انکار کر دے۔ اس کے لیے یہی جزوی صداقت وہ قدرِ مشترک بن جاتی ہے جس سے وہ اپنے مخاطب کو کُلّی صداقت تک لے جانے کا کام لیتا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دعوتِ دین کا کام مشکل بھی ہے اور آسان بھی۔ اس میں حقیقی اشکال یہ ہے کہ روح اور مادہ کی ثنویت کا جو تصور صدیوں سے انسان کے دل و دماغ میں راسخ ہو چکا ہے، اُسے نکال باہر پھینکنا اور اس کی جگہ دین اور دنیا کی یکجائی کا عقیدہ ذہن نشین کرانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ایک مذہبی آدمی یہ سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے کہ امورِ دنیا روحانی اور اخلاقی ترقی کا زینہ بن سکتے ہیں۔ اور ایک دنیا دار آدمی کے لیے یہ تسلیم کرنا کہ امورِ دنیا کو مذہب کے تابع کرنے ہی میں انسانیت کی فلاح کا راز مضمر ہے، [illegible] اور مشکل مرحلہ ہے۔

یہ بھی حالات کی عجیب ستم ظریفی اور انسانی فطرت کی [illegible] ہے کہ جس چیز کو آج کا انسان عقیدہ کی شکل میں ماننے کے لیے مشکل ہی سے رضامند ہوتا ہے، اسے عمل کی دنیا میں وہ برابر اپنا رہا ہے۔ دنیا کا شاید ہی کوئی منکرِ مذہب انسان ایسا ہو جو اپنے روزمرہ کے دنیاوی مسائل میں اپنا ایک اخلاقی ضابطہ نہ رکھتا ہو۔ بالکل اسی طرح دنیا کا ہر مذہبی آدمی کسی نہ کسی حد تک "دنیادار" بننے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ اس دنیا میں مذہب اور مادیت فلسفہ کی حد تک تو بلاشبہ دو مختلف کارخانے شمار کیے جا سکتے ہیں لیکن جب ہم ایک عام انسان کی عملی زندگی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم [illegible]

نظریہ کو بالکل باطل پاتے ہیں۔ ہمارا تجربہ اس حقیقت کا شاہد ہے کہ انسانی زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے جس کو روح اور مادہ کی ثنویت میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کُل کو اگر اجزاء میں بانٹا جائے تو اس کی اصلی حقیقت بالکل مسخ ہو جائے گی۔ ہم میں سے ہر شخص خواہ وہ کسی عقیدہ یا خیال کا ہو اپنے ہر دنیاوی معاملہ میں بھی ایک روحانی اور معنوی نقطۂ نظر ضرور رکھتا ہے۔ اس کے بغیر زندگی کا ایک دن بھی نہیں گذر سکتا۔ یہ چیز انسان کی فطرت میں داخل ہے اور اس کے دل کی ایک جذباتی پکار ہے لیکن اسی بات کو جب آج کل کے عام انسان کے سامنے رکھو اور اسے دعوت دو کہ اپنی زندگی کے روحانی، اخلاقی اور مادی پہلوؤں کے لیے ایک نظام اختیار کرے، تو وہ اس تخیل سے اپرائیگا اور رہ رہ کر اس بات پر اصرار کرنے لگے گا کہ مذہب کو دنیوی معاملات سے الگ رکھو۔ عام انسان ہی نہیں، خود اہلِ مذہب میں سے بکثرت لوگ دین و دنیا کی اس یکجائی کو ماننے سے عملاً انکار کریں گے، خواہ نظری طور پر وہ اس کے قائل ہی کیوں نہ ہوں۔

اس مشکل کے باوجود دعوتِ دین کا کام کرنے والوں کے لیے یہی چیز آسانی کا موجب بھی ہے کہ دین و دنیا کی علیحدگی حقیقت میں انسان اور کائنات کی فطرت کے خلاف ہے، اور جیسا کہ ابھی اوپر ہم نے عرض کیا، انسان ان کو الگ کرنے کی ساری کوششوں کے باوجود انھیں واقعۃً الگ کر دینے پر قادر نہیں ہیں۔ انسانی فطرت خود ایک ایسا نظام چاہتی ہے جو دین کو دنیا کے ساتھ اور دنیا کو دین کے ساتھ سمو دے اور ان کے باہمی تضاد کو ختم کر دے۔ اسلام چونکہ ایسا ہی ایک نظام ہے اس لیے وہ انسانی فطرت سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ اسے پیش کرنا اور لوگوں کے دل و دماغ کو اس پر مطمئن کرنا دنیا لازماً ان دوسرے مسلکوں کی دعوت کے مقابلہ میں آسان ہی ہونا چاہیے جو یا تو انسان کی روحانی پیاس کو بجھانا چاہتے ہیں مگر اس کی مادی مشکلات حل نہیں کرتے، یا مادی مشکلات حل کرنا چاہتے ہیں مگر اس کی روح کو پیاسا رکھتے ہیں۔

ممکن ہے یہاں پہنچ کر ایک انسان کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ اگر عملاً دنیا کے سب انسان

(خواہ وہ مذہبی ہوں یا دنیادار) اپنی زندگی میں مادّی اور روحانی و اخلاقی پہلوؤں کو کچھ نہ کچھ سموتے ہی ہیں، اور اسلام بھی ان کو سمونے کا کام ہی کرتا ہے تو پھر اسلام کا امتیاز کس چیز میں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے: اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے مسائل زندگی کے جو حل پیش کیے ہیں وہ بیشتر امتزاجی نوعیت کے ہیں، لیکن اس نے اِس امتزاج میں مختلف افکار و اعمال کے درمیان جو نسبتیں قائم کی ہیں وہ خالصتاً اُس کی اپنی ہیں۔ اور یہی اُس کی امتیازی خصوصیت ہے۔ آپ زندگی میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں انسانوں سے ملتے ہیں لیکن ان میں سے ہر چہرے کو دوسرے سے مختلف پاتے ہیں، حالانکہ اعضاء کے اعتبار سے وہ سب ایک سے ہوتے ہیں۔ ان میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ اعضاء کا نہیں بلکہ اُس تناسب کا ہے جو ان اعضاء کے درمیان موجود ہوتا ہے اور یہی چیز ایک چہرے کو دوسرے سے ممیز کرتی ہے۔ بالکل اسی طرح اسلام دوسرے مذاہب و ادیان اور مسالکِ زندگی یا تحریکات سے بالخصوص جس چیز میں مختلف ہے وہ یہ ہے کہ اس نے انسانی زندگی کے بیشتر شعبوں کے درمیان نسبتوں کا جو رشتہ قائم کیا ہے وہ خالصتہً اس کا اپنا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کی اقدارِ حیات دوسروں سے بالکل مختلف ہیں اور اسی چیز میں اُس کی انفرادیت منعکس ہوتی ہے۔ ان حالات میں ایک داعی کا کام صرف اسی قدر ہے کہ باطل نظریات نے خالق و مخلوق کے درمیان نسبتوں کے جو غلط تعلقات قائم کر رکھے ہیں اُنہیں بدل کر صحیح بنیادوں پر اُستوار کرے۔ اگر بندے اور اس کے رب کے تعلقات کی نوعیت درست ہو جائے تو اس سے نہ صرف آخرت سنور جاتی ہے بلکہ اس دنیا کی زندگی سے بھی فساد مٹ جاتا ہے اور یہاں امن و امان کا دور دورہ ہوتا ہے۔

قرآن حکیم میں متعدد مقامات ایسے ملتے ہیں جہاں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ زندگی سے اختلال اُسی وقت دُور ہو سکتا ہے جب انسانوں کا اپنے خالق کے ساتھ رشتہ درست ہو۔ جب تک اس رشتہ کو صحیح نہیں کیا جائیگا اس وقت تک زندگی سے بُرائی کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ جب حضرت

لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کو ایک عادتِ بد سے باز رہنے کی دعوت دی تو سب سے پہلے انھیں اس بات کی نصیحت کی کہ تم اللہ سے ڈرو کیونکہ اللہ کے خوف کے مٹ جانے سے ہی فسق و فجور کے سارے چشمے پھوٹتے ہیں۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ الْمُرْسَلِينَ ۔ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۚ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ أَتَأْتُونَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعَالَمِينَ ۔ وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ ۚ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ عَادُونَ ۝ (الشعراء - ۸)

قوم لوط نے پیغام لانے والوں کو جھٹلایا۔ جب اُن کے بھائی لوط نے اُن سے کہا کیا تم ڈرتے نہیں، میں تمھارے لیے پیغام لانے والا امین ہوں لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔ میں تم سے اس کا کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر پروردگارِ عالم کے پاس ہے۔ کیا تم جہان کے مردوں کے پاس جاتے ہو اور ان بیویوں کو چھوڑ دیتے ہو، جو تمھارے رب نے تمھارے لیے پیدا کی ہیں؟ بلکہ تم لوگ حد سے بڑھنے والے ہو۔

اسی طرح حضرت شعیب علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو لین دین میں دیانتداری کا سبق دینے سے پیشتر اُسے یہ ذہن نشین کرایا ہے کہ تمھارا اپنے خدا سے تعلق صحیح ہونا چاہیے۔

كَذَّبَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ الْمُرْسَلِينَ ۔ إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۔ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ ۔ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ۝ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝ وَاتَّقُوا

بن کے رہنے والوں نے پیغام لانے والوں کو جھٹلایا جب انھیں شعیب نے فرمایا کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمھاری طرف ایک با امانت پیغمبر آیا ہوں۔ پس اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔ اور میں تم سے اس کا کچھ اجر نہیں چاہتا۔ میرا اجر پروردگارِ عالم کے پاس ہے۔ تم سیدھی ترازو سے تولو اور لوگوں کی چیزیں کم مت کرو اور زمین میں فساد پھیلانے والوں کی حیثیت سے نہ پھرو۔ اور اس ذات سے ڈرو جس نے

الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِیْنَ ○ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ ○ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِیْنَ ○	تمھیں بھی پیدا کیا اور خلقتِ اوّل کو بھی۔ وہ بولے تم پر تو کسی نے جادو کر دیا ہے۔ اور تم بھی ہماری طرح کے انسان ہو اور ہمارے خیال میں تو تم جھوٹے ہو۔

اسی قسم کی بے شمار آیات ہمیں قرآنِ حکیم میں ملتی ہیں جن میں اس بنیادی حقیقت کی طرف نہایت واضح الفاظ میں رہنمائی کی گئی ہے کہ اُس وقت تک اصلاح کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی جب تک کہ انسان اُن نسبتوں کو درست نہ کرے جو خدا اور انسان کے درمیان اور انسان اور اِس کائنات کے درمیان پائی جاتی ہیں۔ حضرت جعفرؓ بن ابی طالب نے نجاشی کے دربار میں دعوتِ دین کے لیے جو فصیح و بلیغ تقریر ارشاد فرمائی وہ اس حقیقت کی آئینہ دار ہے۔ اس تقریر کے دو حصے ہیں۔ ایک میں انھوں نے یہ بتایا ہے کہ جب ہمارے خالق کے ساتھ تعلق کی نوعیت صحیح نہ تھی تو ہم میں کون کون سی بُرائیاں پائی جاتی تھیں، اس کے بعد جب ہمیں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں خدا وند تعالیٰ سے صحیح تعلق قائم کرنے کی توفیق حاصل ہوئی تو پھر ہماری زندگی کے سارے گوشوں میں ـــــ خواہ ان کا تعلق امورِ دنیا سے تھا یا امورِ آخرت سے ـــــ ایک خوشگوار انقلاب آیا۔ انھوں نے فرمایا:

"اے بادشاہ! ہماری قوم کی یہ حالت تھی کہ ہم سب جاہل تھے، بتوں کی پرستش کرتے، مُردار کھاتے، بُرے کاموں کے مرتکب ہوتے۔ رشتے ناتے توڑ دیتے، پڑوسیوں سے بُرا سلوک کرتے تھے۔ ہم میں سے قوی کمزور کو کھا جاتے۔ ہماری زبوں حالی کا یہ عالم تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری جانب ہمیں میں سے ایک شخص کو رسُول بنا کر بھیجا۔ جس کے نسب، سچائی، امانت اور پاک دامنی کو ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس نے ہمیں تعلیم دی کہ ہم اللہ تعالیٰ کو یکتا مانیں اور اُسی کی عبادت کریں۔ ہم اور ہمارے بزرگوں نے اس کو چھوڑ کر پتھروں اور

بتوں کی جو پرستش شروع کر رکھی تھی اس کو ترک کر دیں۔ اس رسول نے ہمیں صداقت، امانت، صلہ رحمی اور پڑوسیوں سے حسن سلوک، حرام باتوں اور قتل و خونریزی سے باز رہنے کا حکم دیا اور ہمیں بری باتیں، جھوٹ بولنے، یتیم کا مال کھانے اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے سے منع فرمایا۔ اس نے ہمیں حکم دیا کہ خدائے یکتا کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اس نے ہمیں نماز، زکوٰۃ اور روزوں کا حکم دیا۔ ہم نے اس ذات کی تصدیق کی اور اس پر ایمان لے آئے[1]"

یہ تقریر اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ جب خدا کے ساتھ بندے کا تعلق درست نہ ہو تو اس سے نہ صرف اس کی روحانی زندگی میں، بلکہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی میں بھی بگاڑ پیدا ہوتا ہے، لیکن جب اس تعلق کو صحیح کر دیا جائے تو اس سے پوری زندگی تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس سے نہ صرف فکر میں سلجھاؤ، طبیعت میں سلامت اور روح میں لطافت پیدا ہوتی ہے بلکہ معاشرت میں حسن سلوک، تمدن میں توازن، اور معیشت میں عدل و مواساۃ کا دور دورہ ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا پارس ہے جس کی تاثیر اگر کوئی ٹھیک ٹھیک قبول کرے تو کندن بن جائے۔

---

[1] سیرت ابن ہشام ص ۳۵۸

اسلامی حکومت میں ملازموں کے حقوق و فرائض

(پروفیسر لبیب السعید مصری)

اسلامی حکومت میں کارکنانِ حکومت اور سرکاری عہدیداروں کے فرائض و واجبات اور اوصاف و آداب معلوم کرنے کے لیے جب ہم اسلامی لٹریچر کی ورق گردانی کرتے ہیں تو اس بارے میں ہمیں معلومات کا اس قدر وسیع اور تفصیلی ذخیرہ دستیاب ہوتا ہے کہ اس مسئلے کا کوئی گوشہ ایسا باقی نہیں رہتا جس میں صاحبِ تحقیق کو تشنگی محسوس ہوتی ہو۔ البتہ یہ ذخیرہ یکجا اور مرتب شکل میں نہیں ہے اس لیے اس میدان میں تحقیق و طلب کے لیے اترنے والے کو مختلف کتابوں کی ورق گردانی اور مختلف گلستانوں سے گل چینی کرنی پڑتی ہے۔ یہ ذخیرہ اپنے دامن میں صحت مند اور مستحکم و مربوط ایڈمنسٹریشن کے ایسے حکیمانہ اور مصلحت آمیز عجائب و نوادر رکھتا ہے کہ اس کے مقابلے میں جدید ترقی یافتہ ادارہ ہائے حکومت حد درجہ ناقص اور نارسا معلوم ہوتے ہیں۔ جب ہم اسلامی نظام کے قیام کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس مطالبے کے ساتھ ہمیں یہ ضرورت بھی دامن گیر ہوتی ہے کہ اسلام کے سروس سسٹم اور حکومت کے نظم و نسق کے محاسن و امتیازات سے بھی عوام کو روشناس کرائیں تاکہ انھیں غیر اسلامی نظامِ حکمرانی اور اسلامی نظامِ حکومت میں تقابل کرنے میں آسانی رہے۔ زیرِ نظر مضمون اسی غرض کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ اپنے موضوع پر حرفِ آخر نہیں ہے تاہم اس خاکے سے اِس موضوع کے خدّ و خال کسی قدر معلوم کیے جا سکتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مدینہ میں اسلامی ریاست کا سنگِ بنیاد رکھا تو اس کے قیام کے ساتھ ہی ایک ایسا نظامِ عمل وجود میں آگیا جس کا بارِ امانت اٹھانے کے لیے خدا ترس، دیانتدار اور احساسِ ذمہ داری رکھنے والے کارکنوں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ وہ مختصر سے مختصر جماعت اور چھوٹی سے چھوٹی اجتماعی مہم کے لیے بھی اپنا امیر اور سربراہ منتخب کریں۔ اس طرح آپؐ نے نہایت حکیمانہ طریقے سے چھوٹے چھوٹے اجتماعی کاموں میں نظم و ضبط کی تلقین

فرما کر بڑے پیمانے پر ہونے والے اجتماعی کاموں میں نظم و نسق اور جماعتی شیرازہ بندی کی ضرورت اور اہمیت واضح کر دی[۱]۔ اور اسلامی ریاست کے لیے موزون و مطلوب کارکنوں کی تربیت کا دائمی انتظام کر دیا۔ مدینہ میں تمام معاملات کی سربراہ کاری اور رہنمائی اپنے ہاتھ میں لے لی اور مدینہ کے باہر دور و نزدیک کے مقامات پر اپنی جانب سے عُمّال و والیان کا تقرر کیا۔ جنگی مہم درپیش ہوئی تو فوج کے لیے سپہ سالار نامزد کیے۔ زکوٰۃ و صدقات کی جمع و تقسیم کے لیے محصلین اور عاملین کا بندوبست کیا[۲]۔

موجودہ حکومتوں کے صیغہ ہائے نظم و نسق جن کا عرب کی قدیم دنیا میں ہم تصوّر بھی نہیں کر سکتے، مدینہ کی اسلامی حکومت میں اُن میں سے بیشتر کا وجود ہمیں ملتا ہے۔ چونکہ موجودہ ترقی یافتہ حکومت کی محکمانہ اصطلاحات اُس وقت رائج نہ تھیں۔ اِس لیے اِن اصطلاحات (TERMS) سے اُس وقت کے محکمے موسوم نہ تھے مگر عملاً یہ صیغہ جاتی نظام اپنے سادہ و مختصر اور ابتدائی رنگ میں موجود تھا۔ خود عہدِ نبوّت میں ہم کو وزارت اور سررشتۂ کار کی متعدد صورتیں اور سفارت و قضا کے مناصب کا وجود ملتا ہے۔ کارپردازانِ حکومت میں سے مطالباتِ حکومت وصول کرنے والے، محافظینِ امنِ عامہ، اربابِ تعلیم و صحت، مالیات و جنگی امور کے ذمّہ دار، غنائم اور اموالِ فَے کے منتظمین اور ترجمانِ حکومت وغیرہ کے عہدے ملتے ہیں بلکہ بعض ایسے مناصب بھی ملتے ہیں جو مزاج و ضرورت کے لحاظ سے ترقی یافتہ اور متمدن گورنمنٹ سے مختص ہیں جیسے پرائیویٹ سیکرٹری اور افسرِ استقبال کے منصب[۳]۔

لیکن جیسا کہ مَیں اُوپر گذارش کر آیا ہوں ان اعمال و مناصب کی اصطلاحات کے وہ لباس نہ تھے جو آج رائج ہیں اور نہ تصنّع اور شکوہ و طمطراق کے وہ مناظر نظر آتے ہیں جو دورِ حاضر کی حکومتوں کا خاصہ قرار پا چکے ہیں۔

اسلام میں سرکاری منصب کا تصوّر اور اس کے تقاضے | اسلام سرکاری ملازمت اور عہدیداری کو حصولِ جاہ و منزلت، منفعت جوئی اور کسبِ دنیا کا ذریعہ نہیں قرار دیتا بلکہ اسے ایک ناگوار تکلیف اور امت کی

۱؎ الحسبۃ فی الاسلام - ابن تیمیہ ص ۵ - ۲؎ ایضاً ص ۱۸ ۳؎ التراتیب الاداریہ، محمد الکتانی (رباط، مراکش) ج ۱ ص ۳، ۴۰، ج ۲ ص ۴۴

پاسبانی کی کٹھن اور زہرہ گداز ذمہ داری قرار دیتا ہے۔ جو شخص اس ذمہ داری کو اپنی پُشت پر لا دیتا ہے اور پھر اُس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بجائے اطمینان سے گھر بیٹھ رہتا ہے یا تغافل برتتا ہے وہ خدا کی نگاہ میں مبغوض ٹھہرتا ہے اور قیامت کے روز اہلِ جنت کے زمرے میں اُس کا کوئی مقام نہیں ہوگا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ما من امیر یلی امر المسلمین ثم لا یجهد لهم وینصح الا لم یدخل الجنة معهم [1]	جو شخص مسلمانوں کے معاملات کا ذمہ دار بنایا جائے پھر نہ تو وہ اُن کے لیے دوڑ دھوپ کرے اور نہ اُن کی خیر خواہی کرے وہ جنت میں نہیں جائے گا۔

اسلام کا تقاضا صرف یہ نہیں کہ اس ذمہ داری کو پوری سرگرمی اور بے نفسی سے ادا کیا جائے بلکہ کارکنانِ حکومت سے اسلام یہ بھی مطالبہ کرتا ہے کہ وہ رعایا اور ماتحتوں کے ساتھ نرمی، دلداری اور شفقت و محبت کا برتاؤ کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے رحم حکام کے بارے میں فرمایا ہے: اِنّ شرّ الرعاء الحطمة [1] (بدترین حاکم حطمہ ہے) حطمہ کے معنی ہیں پامال کرنے والا یعنی ایسا سنگدل اور سخت گیر حاکم جو رعایا کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی سے معاملہ کرنے کے بجائے درشت مزاجی اور تند خوئی کا رویہ اختیار کرتا ہے اور ان کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کرنے کے بجائے اسے پامال کرتا ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ جہاں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نیکدل اور مشفق حاکم کے حق میں اللہ سے مہربانی کی دعا کی ہے وہاں سخت گیر اور بدخواہ حاکم کے لیے بددعا کی ہے۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

اللهم من ولی من امر امتی شیئا فشق علیهم فاشفق علیه، ومن ولی من امر امتی شیئا فرفق بهم فارفق به [2]	اے اللہ! جو شخص میری امت کے لوگوں کے کسی معاملہ کا ذمہ دار بنایا جائے اور وہ ان کو مشقت میں ڈالے تو تو بھی اُسے مشقت میں ڈال، اور جو ان کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرے تو بھی اُس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کر۔

ایک اور روایت میں رعیت کی بدخواہی اور حق تلفی کو ایسا سخت جرم بتایا گیا ہے، جو قیامت کے

[1]، [1]، [2] صحیح مسلم،

روز حکمران کو جنت سے محروم اور اللہ کے غضب کا مستحق قرار دینے کے لیے کافی ہیں:

ما من عبد یسترعیه الله رعیة یموت یوم یموت وھو غاش لرعیته الا حرم الله علیه الجنة۔[۱]

جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کا چرواہا (حاکم) بنایا اور وہ اس حال میں مرا کہ اس نے لوگوں کی بدخواہی کی ہے تو اللہ تعالیٰ اُس پر جنت حرام کر دیگا۔

اس کے بالمقابل جو حکام اعتدال پسندی، انصاف پروری اور شفقت سے معاملات کو انجام دیتے ہیں، قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان کی جو عزت افزائی کرے گا اور علوِ مرتبت سے نوازے گا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نہایت بلیغ اور مؤثر انداز میں بیان فرمایا ہے:

ان المقسطین عند الله علی منابر من نور عن یمین الرحمان عز وجل، وکلتا یدیه یمین الذین یعدلون فی حکمھم و اھلیھم وما ولوا۔[۲]

عدل و انصاف کرنے والے امراء و حکام نور کے منبروں پر اللہ تعالیٰ کے داہنے بیٹھے ہوں گے اور اللہ کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے فیصلوں میں اور اپنے اہل و عیال میں اور اپنے دائرہ اقتدار میں انصاف کرتے رہے۔

ذمہ داریوں کی اسی نزاکت اور گرانباری کے پیشِ نظر اسلام ایسے لوگوں کو مناصب حکومت سے محترز رہنے اور ان سے دامن کش رہنے کی ترغیب دیتا ہے جو اپنے اندر ان کے بارِ گراں کو اٹھانے کی سکت نہ پاتے ہوں یا ان کو کما حقہ ادا کرنے سے قاصر رہیں۔ ایسے لوگوں کو اسلام پکار پکار کر کہتا ہے کہ جو لوگ حکومت کے عہدوں کو اہلیت و استحقاق کے بغیر حاصل کرتے ہیں اور پھر اُن سے کما حقہ عہدہ برآ نہیں ہوتے وہ خائن ہیں اور قیامت کے روز یہی عہدے اُن کے لیے رسوائی اور ندامت کا باعث ہوں گے۔[۳] دوسری طرف اسلام یہ ترغیب بھی دیتا ہے کہ جو باہمت ان ذمہ داریوں کی دشوار گھاٹیوں کو عبور کرنے کی قدرت رکھتے ہوں اور اُن میں وہ شرائط پائی جاتی ہوں، جو ان ذمہ داریوں کی بجا آوری کے لیے مطلوب ہیں تو یہ انہی کو تفویض کی جائیں۔ ایسی صورت میں یہی منصب تقرب الی اللہ کا ذریعہ بن جاتا ہے اور جو اسے ہمت کی آخری حد تک ادا کرنے کی کوشش کرتے

۱۔ ۲۔ ۳۔ صحیح مسلم

ہیں، اللہ کے نزدیک اُن کی یہ کوشش افضل الاعمال اور بزرگ ترین نیکی شمار ہوتی ہے[1]۔

اَلْاَمْثَل فَالْاَمْثَل کا اصول کارکنوں کے تقرر و انتخاب میں اسلامی حکومت "الامثل فالامثل" کا اصول اختیار کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ موجود ہوں اُن میں سے بہتر سے بہتر اور اہل تر کو ترجیح دی جائے گی جو اس اصول سے انحراف کرتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا معیارِ انتخاب اختیار کرتا ہے اسلام اُسے اسلامی ریاست سے غداری اور خیانت عظمیٰ تصور کرتا ہے۔ ذیل کا قول جو غالباً آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب منسوب ہے، اس امر کی صراحت ملتی ہے:

من قلّد رجلا علی عصابة وھو یجد فی تلك العصابة من ھو ارضی منه فقد خان اللہ ورسوله وخان المومنین[2]۔

جس نے مسلمانوں کے کسی گروہ پر ایسے شخص کو سربراہ کار بنا دیا کہ اس گروہ میں اس سے زیادہ بہتر شخص موجود تھا اُس نے اللہ سے، اس کے رسولؐ سے اور عام مسلمانوں سے غداری کی۔

اسلامی نظامِ حکومت کا ایک خاصہ یہ ہے کہ اس میں ریاست کے کارفرماؤں اور کارپردازوں کے سامنے خوب و ناخوب کے جو پیمانے رکھے جاتے ہیں اور سعادت و شقاوت کے جو معیارات قائم کیے جاتے ہیں، ان میں بنیادی تصور حاکمِ اعلیٰ (اللہ تعالیٰ) کی رضا جوئی اور فلاحِ آخرت اور حاکمِ اعلیٰ کی رعیت کی بہبودی ہوتا ہے۔ یہ تصور بڑے سے بڑے عہدیدار سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے اہل کار تک کی کارگزاریوں پر اثر انداز ہوتا ہے اور فی الجملہ رعیت کے حق میں اس کے بڑے مفید اور خوش کن نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے ایک مکتوب میں حضرت ابو موسیٰ اشعری کو اسی بنیادی مقصد کی جانب توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

ان اسعد الرعاة عند اللہ من سعدت به رعیته، وان اشقی الرعاة من شقیت

سب سے زیادہ خوش قسمت حاکم اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جس سے خدا کی خدائی خوشحال ہو اور سب سے

---

[1] الحسبة فی الاسلام، ابن تیمیہ ص ۶ [2] ایضاً ص ۸

بہ رعیتہ[1] زیادہ بدبخت حاکم وہ ہے جس کے سبب سے اللہ کی رعایا بدحال ہو۔

آگے چل کر فرماتے ہیں: "یاد رکھو کہ حاکم کو ایک دن اللہ کے روبرو حاضر ہونا ہے۔ اگر حاکم کجروی اختیار کرے گا تو رعایا بھی کج روی پر اُتر آئے گی اور اس کا وبال حاکم کے سر ہوگا۔" اسلامی نظامِ حکومت ہی نہیں بلکہ ہر نظامِ حکومت کی کامیابی اور مضبوطی کارکنانِ حکومت کی عدل گستری اور انصاف پروری پر موقوف ہے۔ مشہور مقولہ ہے کہ: "اللہ تعالیٰ عادل حکومت کی مدد کرتا ہے خواہ وہ کافر ہی ہو، اور ظالم حکومت کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے خواہ وہ مسلم ہی ہو۔[2]"

کارکنانِ حکومت کے آداب و آئین حکومت کے عمال و حکام سے لے کر ادنیٰ سے ادنیٰ کارکن میں جن آداب و خصائل کا پایا جانا ضروری ہے، اُس کی تفصیل ہم علامہ القلقشندی کی زبان سے نقل کرتے ہیں یہ تفصیل علامہ القلقشندی نے کاتب (دبیر) کے آداب میں بیان کی ہے۔ لیکن آدابِ کاتب میں جو کچھ اُس نے ذکر کیا ہے درحقیقت اُس کا نمونہ ہر عہدیدار اور ہر کارکن کو ہونا چاہیے۔

"اپنے اختیارات اور ذمہ داریوں میں بے لوث اور بے غرض رہے۔ مذموم خواہشات اور کمینہ طریقوں سے محترز رہے۔ نوائے دلگداز اور دلِ دردمند رکھتا ہو۔ حرص و ہوا کے پاس نہ پھٹکے۔ ناپاک نفعوں اور ناجائز نفع اندوزیوں سے بالا رہے ـــ یہ روش اُسے اللہ کے تقرب سے بھی بہرہ مند کرے گی اور حکومت کی نگاہ میں بھی محترم کرے گی ـــ عام شہریوں کے ساتھ اُسے خوش معاملگی اور حسنِ سلوک کا مظاہرہ کرنا چاہیے جو ملازم ان پاک طریقوں کی پابندی کرتے ہیں اُن کے لیے ترقی اور کامیابی کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے ہیں۔ انہی طریقوں سے کم تعلیم والے بڑے بڑے مناصب تک پہنچے اور ایسے لوگوں پر انھیں برتری حاصل ہوگئی جو قابلیت اور فہم و فراست میں اُن سے بدرجہا زیادہ بلند تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے دنیاوی طور پر بھی انھیں مال و دولت سے نوازا۔ قوم کے اندر انھیں قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ انہی خوبیوں نے دُور والوں کو

---

[1] کتاب الخراج ابو یوسف - [2] الحسبۃ فی الاسلام

کو قریب کر دیا اور ان سے عاری لوگوں کو قرب کے باوجود دُور پھینک دیا۔ ان کو اختیار کرکے جو کچھ نہ تھے وہ سب کچھ ہو گئے اور ان کو چھوڑ کر جو لاکھ تھے وہ خاک بھی نہ رہے[1]"

احتساب کا نظام | اسلامی حکومت میں احتساب یعنی ملازمین کی کارگزاریوں کا جائزہ اور ان کی کوتاہیوں اور زیادتیوں کا مؤاخذہ ان فرائض میں سے جن سے غفلت اور تساہل کرنا اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینا ہے۔ اوّلاً تو اسلام ہر مسلمان کے دل میں خواہ وہ حکومت کا کارکن ہو یا عام شہری ہو، دائمی احتساب و بازپرس کرنے والی ایک ایسی باجبروت اور علیم بذات الصدور ہستی کا تصوّر بٹھا دیتا ہے کہ اس تصور کے ہوتے ہوئے کوئی شخص کسی وقت بھی خیانت و بدعہدی کا خیال بھی نہیں کر سکتا خواہ اُسے کتنے مفید اور محفوظ مواقع میسر آتے ہوں اور ثانیاً وہ ریاست کے ذمہ داران و عمائد کے فرائض میں یہ شامل کرتا ہے کہ وہ عمّال و حکّام کے تقرر کے بعد اُن کے اعمال و اشغال کا برابر محاسبہ کرتے رہیں اور ان کی پرائیویٹ زندگی اور پبلک زندگی کا جائزہ لیتے رہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ ملک کے دُور دراز حصوں میں رہنے والے عمّال اور شہریوں کے بارے میں بھی اِنکو اتنی ہی وسیع معلومات ہوتی تھیں جتنی اُس شخص کے بارے میں ہوتی تھیں جس نے اُن کے ساتھ ایک بستر پر اور ایک تکیے پر رات گذاری ہو۔ ملک کا کوئی حصہ اور کوئی گوشہ اور ریاست کا کوئی عامل اور فوج کا کوئی سپہ سالار ایسا نہ تھا جس پر اُن کی کڑی نگاہ نہ ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ ملک کے مشرقی کنارے سے لے کر مغربی کنارے تک رہنے والوں کی باتیں صبح و شام اُن تک پہنچتی رہتی تھیں[2]۔

موجودہ حکومتیں ملازمین حکومت کی پرائیویٹ زندگی کو اپنے دائرۂ احتساب سے خارج سمجھتی ہیں، لیکن اسلامی ریاست میں بڑے سے بڑے عہدیدار بھی اپنے خالص ذاتی تصرفات میں جو حکومت کی نگاہ میں قابلِ اعتراض ہوں، حکومت کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ حذیفہ بن الیمان نے ایک غیر عرب عورت سے شادی کر لی۔ حضرت عمرؓ کے علم میں جب یہ بات آئی تو انھوں نے حذیفہ کو حکم دیا کہ اس عورت کو طلاق دے دو اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ "عجمی عورتوں میں دلکشی پائی جاتی ہے۔ اگر تم لوگ ان کی طرف لپک

---

[1] صبح الاعشیٰ جلد اول ص ۱۷ [2] التاج المنسوب للجاحظ ص ۱۶۸

گئے تو یہ تمہیں عربی عورتوں پر جابر بنا دیں گی؟[۱]

جو حکومت کا کارکن اپنے ایمان و ضمیر کے تقاضوں کو پامال کرتا ہے اور اپنے اوپر عائد شدہ ذمہ داریوں سے اپنے نفس کو کھلی چھٹی دے دیتا ہے اس پر "نا اہل" کے ریمارکس دے کر سبکدوش نہیں کر دیا جاتا، بلکہ تمام سابقہ کارگزاریوں کی اسے جوابدہی کرنی پڑے گی۔ اپنی کوتاہیوں کا پائی پائی حساب دینا ہوگا۔ اور اس کے بعد اسے ایسی قرار واقعی سزا دی جائے گی جو اس کے ابنائے جنس کی آنکھوں کو کھول دینے کے لیے کافی ہو۔ سلطنت عباسیہ کے چیف جسٹس امام ابو یوسف رحمہ اللہ خلیفہ ہارون الرشید کو ایک نامے میں ہدایت کرتے ہیں:

"بہتر یہ ہے کہ آپ نیکوکار، پاکیزہ دامن اور قابل اعتماد افراد پر مشتمل ایک پارٹی ملک میں بھیجیں جو شہروں اور قریوں میں جا کر عمّالِ ریاست اور ان کی کارگزاریوں کی تفتیش کرے ... ... پھر جب آپ کو کسی گورنر یا افسر کے بارے میں یہ اطمینان ہو جائے کہ وہ ظلم و تعدی اور دست درازیاں کرتا ہے، رعایا کی دیکھ بھال کے بارے میں آپ کے ساتھ بد عہدی کرتا ہے، سرکاری اموال کا غبن کرتا ہے یا حرام خوری پر اتر آیا ہے یا اس کے چال چلن میں خرابی پیدا ہو گئی ہے تو اس کے بعد آپ کے لیے اس گورنر یا افسر کو استعمال کرنا، رعیت کے کسی کام کا ذمہ دار بنانا یا اسے امورِ مملکت میں شریک کرنا حرام ہے۔ بلکہ ایسے بدطینت شخص کو آپ کیفر کردار تک پہنچائیں اور اسے ایسی سخت سزا دیں کہ دوسرے جو ابھی تک ان خرابیوں سے ملوث نہیں ہوئے ہیں، اسے دیکھ کر عبرت پذیر ہوں، البتہ مظلوم اور بے گناہ کی آہوں سے آپ بچتے رہیں۔ ان کی دعائیں بارگاہ ایزدی میں مستجاب و مقبول ہیں[۲]"

یہ بھی ضروری ہے کہ ملازمین اور کارندوں کے متعلق حکومت کے پاس جو رپورٹیں آئیں، وہ نہایت صحیح، حقیقت کا آئینہ اور اعتدال پسندانہ ہوں۔ قاضی ابو یوسف اس سلسلے میں بھی ہارون رشید

---

[۱] الطبری جلد ۴ ص ۷۴ [۲] الخراج، ابو یوسف ص ۱۲۳

کو تاکید کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"ہو سکتا ہے کہ رپورٹ دینے والے پبلک کے خلاف عمّال سے ساز باز کریں۔ اور عمّال کی بدمعاملگیوں پر پردہ پوشی کریں۔ یا اس کے برعکس عمّال اور حکام سے بگڑ جائیں اور ان پر خلاف واقعہ الزامات لگا دیں۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ آپ ہر شہر اور ہر علاقے میں سے عادل اور ثقہ لوگوں کو ڈھونڈیں اور خبر رسانی اور اطلاعات کا کام ان کے سپرد کریں۔۔۔ اور آپ انہیں پیشگی متنبہ کر دیں کہ وہ رعیت کی کسی بات کو یا حکام کے کسی فعل کو آپ سے چھپا کر نہ رکھیں اور جو رپورٹیں آپ تک پہنچائیں ان میں کسی قسم کی مبالغہ آرائی نہ ہو۔ اس کے بعد جو آپ کی ہدایات پر عمل نہ کریں انھیں کیے کا مزہ چکھائیں۔ جب تک علاقوں میں اطلاعات بہم پہنچانے والے اور خبر رساں معتمد علیہ اور صادق القول لوگ نہ ہوں، کسی قاضی یا کسی حاکم کے بارے میں موصول ہونے والی رپورٹ پر صاد کرنا درست نہیں ہے[۱]"

آزادیٔ رائے | اسلام کارکنانِ حکومت پر ہر طرح کی پابندیاں عائد کرنے کے باوجود انھیں یہ اجازت بھی دیتا ہے کہ وہ جس بات کو بہتر سمجھیں اُسے اختیار کریں۔ ان کی اپنی رائے کو اس حد تک سلب نہیں کرتا کہ وہ محض ایک حکومت کی مشینری کا بے جان پرزہ بن کر رہ جائیں۔ موجودہ حکومتیں اپنے ملازمین اور کارکنوں کے اندر جو غلامانہ ذہنیت اور بندۂ حکم بن جانے کا مزاج پیدا کرتی ہیں اس کی بنا پر کوئی کارکن یہ اپنے وہم و خیال میں بھی نہیں لا سکتا کہ وہ اگر افسرِ اعلیٰ کے کسی حکم کو خلافِ مصلحت اور غیر مناسب سمجھے تو اس کی تعمیل سے رُک جائے۔ لیکن اسلامی دورِ حکومت میں ہمیں متعدد ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ اوپر سے ایک حکم نافذ ہوتا ہے جسے کارکن بہتر اور مقصدِ اعلیٰ کے منافی تصور کرتا ہے تو اس کی تعمیل سے ہاتھ روک لیتا ہے۔ زیاد نے ایک بار حکم بن عمرو غفاری کو لکھا کہ امیر المومنین معاویہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس کے لیے سونا اور چاندی جمع کروں لہٰذا تم لوگوں میں سونا اور چاندی تقسیم نہ کرو اس کے ماسوا جو چاہو تقسیم کرو۔ حکم بن عمرو نے جواب دیا: امیر المومنین کے حکم سے

---

[۱] الخراج، ابو یوسف ص ۱۱۴، ۱۱۵

پہلے میرے پاس اللہ کا حکم موجود ہے۔ بخدا! اگر کسی بندے پر زمین و آسمان کے دروازے بند ہو جائیں لیکن وہ اللہ سے ڈرے تو اللہ اس کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ پیدا کر دے گا" یہ کہہ کر انھوں نے لوگوں کو بلایا اور تمام مال بمع سونا و چاندی تقسیم کر دیا[1]۔

اطاعت کے حدود شہریوں کے لیے امراء و حکام کی اطاعت کے معاملے میں اسلام نے جو شرائط اور حدود متعین کی ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کی اطاعت صرف امرِ معروف میں ہوگی اور اگر وہ منکرات کا حکم دیں یا خلافِ شریعت باتوں پر لوگوں کو مجبور کریں تو ایسی صورت میں مسلمانوں پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ اُن کی اِن باتوں پر نکیر کریں، ان سے کھلم کھلا بیزاری کا اظہار کریں، اور صرف امرِ حق کی حمایت کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "ستکون امراء فتعرفون و تنکرون، فمن کرہ بریٔ ومن انکر سلم ولکن من رضی و تابع[2]" (عنقریب تمہارے اندر سے ایسے امراء ظاہر ہوں گے جن کی طرف تم معروف اور منکر دونوں طرح کی باتیں دیکھو گے، سو جس نے منکر کو منکر سمجھا وہ تو بری ہوا اور جس نے اُس کی مخالفت کی وہ سلامت رہا لیکن (عقوبت اور گناہ اس پر ہے) جو اس پر راضی ہوا اور اس کی پیروی کی)۔ ایک دوسری روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ظالم حکام کا ساتھ دینے والے اور ان سے تعاون کرنے والے سے صاف صاف برأت کا اظہار فرمایا۔ من صدقھم بکذبھم واعانھم علی ظلمھم فلیس منی ولست منہ ولا یرد علیّ الحوض[3] (جس نے ان کے جھوٹ کی تائید کی اور ان کے مظالم میں اُن کا ساتھ دیا۔ اُس کا مجھ سے اور میرا اُس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ وہ حوضِ کوثر پر میرے پاس آ سکے گا)۔

منصب کا غلط استعمال حکومت کے ملازمین کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے منصب کو لوگوں پر دھاک بٹھانے اور اپنے رعب و دبدبے کی نمائش کرنے کا ذریعہ بنائیں۔ یا عہدے و اختیارات کے بل بوتے پر لوگوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا شروع کر دیں۔ اسلامی حکومت میں منصب فخر و غرور کی چیز نہیں بلکہ خدمت گذاری کا وسیلہ ہے۔ اس کی ذمہ داریوں کے بار سے گردن جھک جانی چاہیے نہ کہ

لے و سے و سے مسلم

الٹی گردن اکڑ جائے۔ اور رعیت کی خدمت کے بجائے اُس کے لیے عذاب کا پیغام بن جائے۔ حضرت علیؓ اپنے ایک عامل کو لکھتے ہیں: "تو لوگوں کے ساتھ عجز و انکساری سے پیش آ، اُن سے نرمی کا رویہ اختیار کر۔ اور اپنے سلام و کلام میں اور مشوروں اور گفتگوؤں میں اُن کے برابر رہ۔ بڑے اور بااثر لوگ تجھ سے ناانصافی کی توقع نہ باندھیں اور کمزور تیرے عدل سے ناامید نہ ہوں[1]"

اسلامی حکومت اپنے شہریوں کے ساتھ حسن التفات، خبر گیری اور دیکھ بھال کے احساسات رکھتی ہے، اُن کی بنا پر وہ سربراہ کاروں اور نظم و نسق کے متولیوں پر یہ فرض عائد کرتی ہے کہ وہ خود جاجا کر لوگوں کی ضروریات دریافت کریں اور انھیں بروقت مہیا کریں اور اس فرض کی بجا آوری میں کسی شخص کا دوں حیثیت اور عامی ہونا آڑے نہ آئے۔ بلکہ اُن کی نگاہ میں کمین و شریف دونوں کا مقام و اہمیت یکساں ہو۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ابلغونی حاجة من لا یستطیع ابلاغها فانه من ابلغ سلطانه حاجة من لا یستطیع ابلاغها ثبت الله قدمیه یوم القیامة[2]۔

جو لوگ اپنی ضروریات مجھ تک نہیں پہنچا سکتے، تم لوگ خود ان کی ضروریات مجھ تک پہنچاؤ۔ جو حکومت کو حاجتمند افراد کی ضروریات سے آگاہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز (جب لوگوں کے قدم ڈگمگا رہے ہوں گے) اُسے ثابت قدمی بخشے گا۔

اسی احساس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بار ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا: اگر میں زندہ رہا تو تمام ملک کا دورہ کروں گا۔ اور رعایا کے حالات معلوم کروں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ لوگوں کی بعض ضروریات ایسی ہیں جو مجھ تک پہنچ نہیں پاتیں۔ لوگ خود مجھ تک آ نہیں سکتے اور عمّال ان ضروریات کو میرے علم میں نہیں لاتے[3]۔

---

[1] نہج البلاغہ، شریف رضی ج ۲ ص ۵۴

[2] التراتیب الاداریہ، الکتانی

[3] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی حدید

وظائف اور تنخواہیں | تنخواہوں اور وظیفوں کے معاملے میں اسلامی حکومت ہر کارکن کی ضروریاتِ زندگی کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کرتی ہے۔ ابوداؤد کی ایک روایت میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب فئے کا مال آتا تو آپ اُسی وقت تقسیم فرما دیتے۔ اہل وعیال والے کو دو حصے اور مجرّد کو ایک حصہ دیتے [1] تنخواہ میں اضافے کا موجب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خدمت گذار اپنے فرائض میں قابلیت اور محنت ومہارت کا ثبوت دے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک عمل ماثور ہے کہ آپ نے ایک کارکن کے بارے میں، جس نے بعض مواقع پر اپنے کام کو بڑی عمدگی اور خوش اسلوبی سے سرانجام دیا تھا۔ بعد میں آنے والے امراء کو اُس سے خیر خواہی کی وصیت کی۔ بلکہ آپ نے اُسے اپنی ایک تحریر بھی مہر لگا کر دے دی تھی۔ طبقات ابن سعد کے بیان کی رُو سے وہ شخص حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے تک زندہ رہا اور اس پورے عرصہ میں خلفاء سے مختلف چیزیں وصول کرتا رہا [2] معاشی اور اقتصادی ضروریات ایسی ہیں جن سے بہرحال اسلامی حکومت اپنے کارکنوں اور کارپردازوں کو بالکل فارغ البال اور یکسو کر دینے کا اصول رکھتی ہے، تاکہ وہ سرکاری خدمات کو سکونِ خاطر، اطمینانِ قلب اور بے لوث طریقے سے انجام دیتے رہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے اسی فلسفے کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے ایک عامل کو حکم دیا تھا کہ سرکاری کارکنوں کو پورے معاوضے دیئے جائیں کیونکہ:

فان ذلك قوة لهم على استصلاح انفسهم وغنى لهم عن تناول ما تحت ايديهم وحجة عليهم ان خالفوا امرك اوثلموا امانتك [3]

یہ چیز کارکنوں کو راست باز، نیک نفس رکھنے میں مدد دے گی، اور انہیں سرکاری اموال پر دست درازی کرنے سے بے نیاز کر دیگی۔ اور اگر اس کے بعد وہ تیرے حکم کی خلاف ورزی کریں گے یا تیری امانت میں خیانت کریں گے تو تیری طرف سے اُن پر حجت قائم ہو جائے گی

حضرت عمر بن عبدالعزیز پر ایک بار یہ اعتراض کیا گیا کہ آپ اپنے عمّال کو سو سو دو دو سو دینار بلکہ اس سے بھی زیادہ ماہانہ تنخواہیں دیتے ہیں؟"۔ خلیفۂ راشد نے جواب دیا: "اگر یہ لوگ اللہ کی کتاب اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم

[1] الادارة الاسلامیہ، کرد علی ص ۱۷۸ [2] التراتیب الاداریہ، کتانی [3] الادارة الاسلامیہ ص ۶۰

کی سنت پر عامل رہیں تو میں یہ معاوضے بھی ان کے لیے معمولی سمجھتا ہوں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ غم روزگار سے ان کو بالکل فارغ البال کر دوں[1]۔"

کارکنوں کے معاوضے مسلمانوں کے بیت المال سے جاری کیے جائیں گے۔ کیونکہ وہ مسلمانوں ہی کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ہارون رشید نے ایک بار قاضی ابو یوسفؒ سے دریافت کیا تھا کہ "کیا قاضی کو میراث کے مال میں سے وظیفہ ملے گا؟" قاضی ابو یوسف نے جواب دیا: "نہیں، اُسے بھی مسلمانوں کے بیت المال سے وظیفہ دیا جائے گا۔"

صلہ اور پنشن | اسلامی حکومت میں خدمت گذاروں کو عمدہ کارکردگیوں کے صلے دینے اور فراغت کے بعد انھیں پنشن دینے کی مثالیں بھی سیرت و تاریخ کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ صلہ دینے کے بارے میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے اس کی متعدد نظیریں حدیث و آثار کے ذخیرے میں موجود ہیں۔ آپ نے ہمدان کے ایک شخص قیس بن مالک الارجی کو اس کی قوم پر جس میں عرب بھی تھے اور آزاد کردہ غلام بھی تھے، عامل مقرر کیا تو آپ نے اس کا وظیفہ جاری کیا اور اس کے علاوہ اُسے مستقل طور پر دو سو صاع سالانہ نسار کی ملکے اور دو سو صاع سالانہ خیوان کے الخبیسر بطور صلہ عطا کیے۔ آپ کا یہ عطیہ نہ صرف حین حیات اسے ملتا رہا بلکہ مرنے کے بعد اُس کے ورثاء بھی اُسے ہمیشہ وصول کرتے رہے[2]۔

حضرت عمرؓ بن عبد العزیز نے یہ فرمان جاری کیا تھا کہ ایسے یتیم اور لاوارث بچے اُن کے علم میں لائے جائیں جن کے باپ حکومت کے تنخواہ دار تھے۔ جب آپ کو ایسے افراد کی فہرست پہنچی تو آپ نے ان میں سے پانچ پانچ کو ایک خدمتگار دیا، اور ان میں جو غیر شادی شدہ لڑکیاں تھیں اُن کے لیے باقاعدہ وظائف جاری کیے۔ حضرت عمرؓ نومولود بچوں کا وظیفہ اس وقت تک جاری نہیں کرتے تھے جب تک وہ دودھ نہیں چھوڑتے تھے۔ لوگوں نے قبل از وقت بچوں کا دودھ چھڑانا شروع کر دیا۔ جب انھیں خبر ملی تو انھوں نے فوراً اپنے منادی سے اعلان کروا دیا کہ لوگ بچوں کا دودھ چھڑانے میں جلد بازی نہ کریں۔ اب ہر بچے کا وظیفہ مقرر کر دیا گیا ہے[3]۔

[1] الامارۃ الاسلامیہ ص ۱۵۴۔ [2] ایضاً ص ۱۵۱ [3] ایضاً ص ۱۰۵۔

جن ملازمینِ حکومت کو عذر لاحق ہوگیا اور وہ از کار رفتہ ہوگئے ہوں حکومت کی جانب سے ان کی دیکھ بھال اور امداد و اعانت کا انتظام کیا جائے گا حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے دیارِ شام کی طرف ایک فرمان جاری کیا تھا جس میں ایسے ملازمینِ حکومت کے متعلق معلومات کی فراہمی کا مطالبہ کیا تھا جو مفقود البصارت ہوں یا چلنے پھرنے سے معذور ہوگئے ہوں یا فالج زدہ ہوں یا انھیں ایسا دائمی مرض لاحق ہوگیا ہو، جو اولئے نماز میں حارج ہوتا ہو۔ اس کے بعد انھوں نے من جانبِ حکومت ہر نابینا کیلئے ایک محافظ اور ہر دو دائم المرض شخصوں کے لیے ایک خادم کا انتظام کرنے کا حکم دیا[1]۔

ذاتی کاروبار کی ممانعت | اسلامی حکومت کسی ملازم کو دورانِ ملازمت کسی قسم کا ذاتی کاروبار کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ ان کے پاس بہت سامان و اسباب جمع ہوگیا۔ یہاں تک کہ ان کے پاس گھوڑوں کی کئی نسلیں ہوگئیں اور ان کی منتشر زمینیں یکجا ہوگئیں اور ان کی تجارت بھی خوب چمکی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا: حضرت اس مال میں سے آپ اپنا راس المال اور اپنی تنخواہ قابو کریں اور باقی پورے کا پورا بیت المال کے حوالے کریں[2]۔

سرکاری اشیاء کا ذاتی تصرف | ملازمین سرکاری اشیاء کو ذاتی تصرف میں لانے کے مجاز نہیں ہیں۔ قلم و کاغذ سے لے کر حکومت کی گاڑیوں اور ذرائع نقل و حمل تک کسی چیز سے اپنی ذات کے لیے انتفاع نہیں کر سکتے۔ سرکاری اشیاء دراصل قوم کی امانت ہوتی ہیں اور ان کو صرف قوم کے مفاد و مقاصد میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر محکمہ ڈاک کا کوئی ملازم ڈاک کی گاڑیوں کو غیر سرکاری کام کے لیے استعمال کرتا ہے تو وہ خیانت کا مرتکب ہوتا ہے۔ قاضی ابویوسف کتاب الخراج میں اسی بحث پر گفتگو کرتے ہوئے یہ واقعہ درج کرتے ہیں کہ ایک بار حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا ایک غلام بلا اجازت ڈاک کے جانور پر ایک شخص کو سوار کرکے لے آیا تو آپ نے اسے بلایا اور کہا کہ جب تک تو اس کا کرایہ بیت المال میں جمع نہیں کرے گا یہاں سے نہیں ہل سکتا۔

"صرخ خیلنے" کا استیصال | عمرؒ بن عبدالعزیز عاملِ مین کو لکھتے ہیں:۔

---

[1] الادارۃ الاسلامیہ لکرد علی صفحہ ۔۔ [2] ایضاً ص ۴۹

"میں اگر تجھے حکم دوں کہ تو مسلمانوں کی ظلم و زیادتی کی شکایات کا جواب دے تو کیا تو میری طرف مراجعت کی ضرورت محسوس کرے گا۔ نہ بُعدِ مسافت کا خیال کرے گا اور نہ موت کے حادثات کا۔ حتیٰ کہ اگر میں لکھوں کہ فلاں مسلمان کی ظلم سے لی ہوئی بکری واپس کر تو کیا تو مجھے لکھ بھیجے گا کہ سفید دوں یا کالی دوں؟ ــــ یاد رکھ شکایات کا فیصلہ وہیں کر لے میری طرف بار بار رجوع کرنے کی ضرورت نہیں۔"

اسی انداز کا ایک نامہ کوفہ کے عامل کو لکھتے ہیں:

"میرا خیال ہے کہ اگر میں تجھے لکھوں کہ فلاں آدمی کو ایک بکری دے تو تُو مجھے لکھے گا کہ نر دُوں یا مادہ۔ اگر میں لکھ بھیجوں کہ کوئی ایک دے دے، تو تُو پھر یہ پُوچھنے لگے گا کہ چھوٹی ہو یا بڑی۔ اگر میں جواب دوں: "کوئی ایک ہو" تو پھر ایک خط دوڑائے گا کہ بھیڑ ہو یا بکری؟ جب میں نے ایک بار لکھ دیا کہ ایسا کر، تو اپنی صوابدید پر اس کی تعمیل کر۔ میری طرف بار بار رجوع کرنے کی حاجت نہیں۔"

ارکانِ حکومت اور عام شہریوں میں قانونی مساوات

اسلامی ریاست ہر شہری کو بڑے سے بڑے عہدیدار کے خلاف بھی اس کی ظلم و زیادتی پر قانونی چارہ جوئی کا غیر مشروط حق دیتی ہے۔ اور اس میں کسی قسم کی عدالتی و قانونی تفریق روا نہیں رکھتی۔ عدالت و قضاء کے جو آداب و ضوابط ایک شہری پر لاگو ہوتے ہیں، ریاست کا حاکمِ اعلیٰ بھی اُن کا اُسی طرح سے پابند ہے اور کوئی سیاسی مصلحت اور حکمت قبول نہیں کی جاتی۔ امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ ایک بار انھوں نے حج کے موقع پر تمام عُمّال کو جمع کیا۔ مجمع کے اندر عام لوگ موجود تھے۔ آپ نے کھڑے ہو کر عام لوگوں سے دریافت کیا کہ تم میں سے کسی کو کسی عامل کے خلاف کوئی شکایت ہو تو وہ اٹھ کر بیان کرے۔ راوی کا بیان ہے کہ اتنے بڑے مجمع میں سے صرف ایک شخص اٹھا اور اس نے شکایت کی کہ امیر المومنین، آپ کے عامل نے مجھے سو کوڑے مارے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اُسے اجازت دی کہ وہ عامل سے اپنا قصاص لے لے۔ یہ سُن کر حضرت عمروؓ بن العاص لپکے

کہ امیرالمومنین ، اگر آپ نے حکام کے خلاف یہ دروازہ کھول دیا تو ان کے لیے یہ چیز بہت ناگوار ہوگی۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اُن کی کوئی توجیہ تسلیم نہ کی اور فرمایا کہ میں نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ذات کو قصاص کے لیے پیش فرماتے دیکھا ہے تو ان سے کیونکر قصاص نہ دلواؤں۔ بالآخر مدعی نے خود ہی دو سو دینار لے کر قصاص کو معاف کر دیا ورنہ حضرت عمرؓ اُس کے حق کو دلوانے پر تلے ہوئے تھے۔

خلافتِ راشدہ کے دور میں اس طرح کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ حتیٰ کہ خود خلفاء عام شہریوں کے برابر عدالت کے کٹہرے میں حاضر ہوتے دیکھے گئے اور ان پر عام شہریوں کی جانب سے دائر کردہ مقدمات قائم ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بالعموم کہا کرتے تھے کہ "جس پر کسی عامل نے ظلم کیا ہو وہ میرے پاس آئے تاکہ میں اُس کا قصاص اُسے دلواؤں۔"

سفارش اور اقربا نوازی سے اجتناب ملکی نظم و نسق کو تباہ و برباد کرنے میں سفارش اور اقربا نوازی سے بڑھ کر شاید ہی کوئی بیماری ہو۔ اسلام کارکنانِ حکومت کے اندر جن اعلیٰ صفات کو دیکھنے کا خواہشمند ہے ان میں سے مقدم صفات نظم و نسق کو سفارش کی دراندازی سے پاک رکھنا اور سرکاری اموال سے خویش و اقارب کے ہاتھ رنگنے سے احتراز کرنا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غلام نے ایک بار حضرت عمرؓ سے سفارش کی کہ اپنے عراق کے عامل کے نام ایک سفارشی چٹھی لکھ دیں کہ کچھ لوگ عراق میں رہتے ہیں وہ اُن کی خاص طور پر آؤ بھگت کرے۔ حضرت عمرؓ نے اُسے سخت ڈانٹا اور کہا: کیا تو لوگوں پر ظلم کا دروازہ کھولنا چاہتا ہے۔ عامل بھی مسلمانوں ہی کا ایک فرد ہے، اُسے بھی وہی کچھ میسر ہے جو دوسروں کو میسر ہے۔" حضرت علیؓ اشتر نخعی کو مصر کی جانب روانہ کرتے وقت نصیحت کرتے ہیں "عمال کی کارروائیوں پر کڑی نگاہ رکھنا کسی عامل کو دوستی اور غرض مندی کی بنا پر مقرر نہ کرنا بلکہ امتحان اور آزمائش کے ذریعے سے اُس کا انتخاب کرنا۔" حضرت معاویہؓ کو اطلاع پہنچی کہ ان کے بھانجے عبدالرحمٰن بن ام الحکم نے، جو کوفہ پر عامل تھا، اپنی امارت میں بدکرداری کا ثبوت دیا ہے۔ حضرت معاویہؓ نے اُسے فوراً بیک بینی و دوگوش مسندِ حکمرانی سے نکال باہر کیا۔ ہادی باللہ نے اپنے مختصر سے دورِ حکومت میں اپنی ماں خیزران کو سختی سے منع کر رکھا تھا کہ وہ امورِ مملکت میں کوئی دخل نہ دے اور اہلِ غرض کی مطلب برآریوں سے

سے، اسے معاف رکھئے۔

رشوت ستانی سے احتراز | اسلام کا پاکیزہ اور خدا پرستانہ نظام اس چیز سے بہت بالا ہے کہ اس کے کارکن رشوت ستانی اور خیانت کی لعنت میں مبتلا ہوں۔ اور نہ صرف دنیا میں عبرت ناک عقوبت کے سزاوار ٹھہریں بلکہ عاقبت میں ان کے لیے جہنم نار کے سوا کوئی ٹھکانہ نہ ہو۔ ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

الراشی والمرتشی کلاهما فی النار — رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں جہنم کا ایندھن ہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ رشوت لینے والے، رشوت دینے والے اور رشوت کی دلالی (الرائش) کرنے والے تینوں پر اللہ کی پھٹکار ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لعنة اللہ علی الراشی والمرتشی فی الحکم۔ — فیصلوں میں رشوت کا لین دین کرنے والوں پر خدا کی لعنت ہے۔

رشوت ستانی کے ساتھ اسلام نے وہ "چور دروازے" (منافذ التحایل) بھی بند کر دیئے جو اس ام الخبائث کے در آنے کے امکانات پیدا کر سکتے تھے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمال اور حکام کے لیے ہدایا کو بھی خیانت میں شمار کیا ہے (ہدایا العمال غلول)۔ ایک مشہور مقولہ ہے کہ "ادھر دروازے سے ہدیہ داخل ہوا اور ادھر کھڑکی سے امانت رخصت ہو گئی"۔ صحاح کی ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو اللتبیہ نامی ایک شخص کو قبیلہ ازد پر محصل مقرر کیا۔ جب وہ حساب سے فارغ ہو کر واپس آئے اور حساب دینے لگے تو کہا کہ یہ بیت المال کا حصہ اور یہ مجھے ہدیہ میں ملا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر غصہ کے علامات طاری ہو گئے اور آپ نے ایک خطبہ دیا جس میں اللہ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے جو انتظام میرے سپرد فرمایا ہے اس میں تم میں سے بعض لوگوں کو میں جب کسی خدمت پر مقرر کرتا ہوں اور وہ اس سے فارغ ہو کر واپس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ تمہارا (بیت المال) حصہ ہے اور یہ مجھے بطور ہدیہ ملا ہے۔ اگر ایسی ہی بات ہے

تو وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں کیوں نہ بیٹھے رہے کہ وہیں بیٹھے بیٹھے ان کے پاس ہدیے آجاتے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ آپ ایسے کارکنوں پر سخت گرفت کرتے رہے جو دوران خدمت خوشحال ہو جاتے تھے۔ آپ کی گرفت سے حضرت ابوہریرہؓ، عمرو بن العاصؓ اور ابوموسیٰ اشعری جیسے جلیل القدر صحابہ بھی نہیں بچ سکے۔ دوسری طرف ہم اسلامی حکومت کے ملازموں کے اندر بھی للہیت اور اخلاص و خدا ترسی کے پاکیزہ جذبات موجزن دیکھتے ہیں کہ انھوں نے ریاست کی خدمت کو زینتِ دنیا اور عیش و تنعم کی خاطر کندھوں پر نہیں اٹھایا بلکہ اسے عین عبادت سمجھا اور پوری بے لوثی اور شانِ استغناء کے ساتھ اُس سے عہدہ برآ ہوتے۔ اور جس پاک دامنی کے ساتھ وہ اس نازک مقام میں داخل ہوئے تھے اسی پاک دامنی کے ساتھ اس سے نکلے اور اللہ کی رضامندی اور رحمت ان کے شاملِ حال تھی۔

سیوطیؒ نے "حسن المحاضرہ فی اخبار مصر والقاہرہ" میں حضرت معاویہؓ کے مشہور سپہ سالار جنگ حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ بیان کیا ہے کہ انھوں نے آرمینیا کے ایک شہر پر چڑھائی کی۔ اسلامی فوجیں ابھی راہ میں تھیں کہ اس شہر کے سرکردہ لوگ اور وہاں کے پوپ کا نمائندہ حبیب بن مسلمہ کے پاس آئے اور ہدایا و تحائف پیش کر کے صلح کی درخواست کی۔ حبیب بن مسلمہ نے صلح کی درخواست منظور کر لی اور ساتھ ایک خط اہلِ شہر کے نام لکھ دیا کہ "میں نے تمھارے تحائف قبول کر لیے ہیں اور انھیں تمھارے جزیہ میں شمار کر لیا ہے۔"

اطلاع:- تفہیم القرآن جلد اول (طبع سوم) از مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی، جو عرصہ سے ختم تھی، محدود تعداد میں طبع ہو چکی ہے اور کاغذ کی کمیابی کے سبب صرف قسم سوم کا کاغذ ہی دستیاب ہو سکا ہے

ہدیہ عام جلد -/-/۱۵ - خصوصی جلد -/-/۱۸ محصول ڈاک عہ

اپنی فرمائش اس پتہ پر تحریر فرمائیں:- **مکتبہ تعمیر انسانیت** - موچی دروازہ - لاہور

"اپنی اصلاح آپ"

(جناب ابوالسلام نعیم صدیقی صاحب)

[یہ ایک تقریر ہے جو جماعت اسلامی لاہور کے ایک ہفتہ وار اجتماع میں کی گئی تھی۔ اب اسے قلمبند کر کے پیش کر رہا ہوں۔ بعض مواقع پر کچھ کلمات کا اضافہ کیا جا رہا ہے ——— ن ص]

اسلام میں تعمیر سیرت اور اصلاحِ کردار کی اصل ذمہ داری ہر شخص کے اپنے اوپر عائد ہوتی ہے۔ یہ بات کہتے ہوئے میں حیاتِ اجتماعیہ کی اہمیت کو کم نہیں کرنا چاہتا۔ میرے نزدیک آدمی تکمیلِ ذات کے لیے صحیح نظامِ جماعت، پاکیزہ معاشرے اور صالح ماحول کا بدرجہ محتاج ہے اور ناسازگار اجتماعی ماحول میں تنہا کسی فرد کا اپنی ذات کی اصلاح و تعمیر کی سعی کرنا ایک ایسا کٹھن امتحان ہے کہ جس کا تصور ہی دل کو لرزا دیتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ برحق ہے کہ عنداللہ ہر شخص اپنا ذمہ دار آپ ہے۔ ہر شخص کو خود جوابدہی کرنی ہے۔ ہر شخص سے اس کی متاعِ قوت و حیات اور اس کے خزانۂ سیرت و کردار کے بارے میں علیحدہ طور پر محاسبہ ہونا ہے کہ اس نے اس کی حفاظت میں کس درجہ کی چوکسی دکھائی، اس کے استعمال میں کہاں تک احتیاط اور حکمت سے کام لیا اور اس کی نشوونما کے لیے ممکن العمل تدابیر سے کہاں تک کام لیا۔ وہاں تو ہر شخص کو عدالتِ الٰہیہ میں اس وقت تک اپنے پیروں پر کھڑے رہنا ہو گا جب تک وہ یہ حساب نہ دے دے کہ اس نے اپنی عمر کن مقاصد و مشاغل میں کھپائی، اس نے جوانی کا خزانۂ قوت کس مہم میں صرف کیا، اس نے کس طریقے سے کیا کچھ آمدنیاں حاصل کیں، ان آمدنیوں کو کن راستوں سے خرچ کیا اور حقیقت کا جتنا کچھ شعور اور فرائض اور ذمہ داریوں اور حلال و حرام کا جتنا کچھ علم اسے ہو سکا اس کے مطابق عمل کرنے میں کہاں تک سرگرمی دکھائی۔ اپنی ذمہ داری کے اس بوجھ میں وہ کسی دوسرے کو شریک نہ کر سکے گا اور دوست، اور عزیز اس کے

شانہ بہ شانہ کھڑے ہو کر اس گھڑی کے کرب میں کوئی حصہ نہیں لیں گے۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی
اس بات کی گنجایش ہے اور ضرور ہے کہ ناسازگار ماحول کی وجہ سے ایک شخص کو عدالتِ آخرت کے محاسبے میں الاؤنس ملے اور جن غیر اختیاری مزاحمتوں اور جبری رکاوٹوں سے دوچار ہو کر وہ بے بس ہو جاتا رہا ہے ان کی اسے منہائی دی جائے۔ لیکن ناسازگار ماحول سے کشمکش کرنے کی ذمہ داری سے وہ کسی حال میں بری نہیں ہو سکتا۔ آخر ایک پاکیزہ نظام جماعت، ایک صاف ستھرا معاشرہ اور ایک سازگار ماحول مہیا کرنا بھی تو خود افراد ہی کی ذمہ داری ہے اور اس مقصد کے لیے جدوجہد کا آغاز کسی ایک فرد ہی کی دعوت سے ہوتا ہے۔ اب اگر فرد پر بنیادی اور ابتدائی ذمہ داری نہ رکھی گئی ہو تو ایک ناسازگار ماحول ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مقدر ہو کے رہ جائے گا اور وہ ناسازگار جبری ماحول افراد کے لیے ایک مستقل عذر بن جائے گا۔ یہ چکر پھر کہیں سے ٹوٹ ہی نہیں سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوتِ اصلاح کا اولین اور براہِ راست مخاطب فرد ہے۔ خدا کے دین کی پہلی پکار ہم میں سے ایک ایک کی روح و شخصیت سے ہے۔ اس کا پہلا پیغام "قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ" کا پیغام ہے۔ اس کے پورے نظام تربیت کا منشا یہ ہے کہ ہم اپنے لیے اپنے ہی اندر ایک مربی و مزکی فراہم کریں۔ خارجی تعاون کے بھی ہم محتاج ہیں اور حصولِ علم اور اصلاحِ عمل میں بیرونی امداد ہمارے لیے نہایت ضروری بھی ہے اور حد درجہ مفید بھی۔ مگر اپنی شخصیت کے اصل معمار ہم خود ہیں اور ہمیں اپنی اصلاح کی سب سے بڑھ کر اپنی مدد کی ضرورت ہے۔

خارج سے مدد | خارج میں انسانی شخصیت و کردار کی درستی کے لیے جو عوامل کام کرتے ہیں ان میں سے ایک قانون کی طاقت ہے۔ مگر قانون کی طاقت صرف ان اجتماعی اعمال پر گرفت کر سکتی ہے جو واضح طور پر دوسروں کے لیے ضرررساں ہوں اور جن کے لیے کافی شہادت بہم پہنچ جائے اور شہادت کی مدد سے واقعات کی صحیح صحیح تصویر و تعبیر سامنے آجائے۔ قانون کی طاقت اپنے فیصلوں میں غلطی کر سکتی ہے، شہادت ناکافی ہونے پر بے بس ہو سکتی ہے، نجی اعمال کے دائرے میں بے تعلق بھی رہتی ہے، وہ محض برائی کے انسداد کی منفی تدابیر تو کر سکتی ہے، مثبت طور پر

تعمیر کردار کا فریضہ انجام نہیں دے سکتی اور پھر اعمال کے ظاہری پردوں کے پیچھے رزم خیر و شر کا جو ہنگامہ بپا ہے اس تک دسترس نہیں رکھتی۔

دوسری طاقت رائے عام کی طاقت ہے جو ہمیں برائی سے رکنے اور بھلائی کی طرف بڑھنے میں مدد دے سکتی ہے۔ معاشرے کی اچھی مستحکم روایات، نظام تعلیم کی طرف سے ذہن کی آبیاری خاندان اور حلقہ ربط و تعارف میں قائم شدہ اقدار اور کسی اصولی جماعت کا نظام تربیت و احتساب یہ سارے عوامل ہمیں بڑی مدد دیتے ہیں۔ لیکن یہ عوامل بھی ہماری رفتار و گفتار ہی تک رسائی رکھتے ہیں اور ہمارے اس عالم باطن میں نہیں اتر سکتے جس کے اندر ہمارے سارے نظام کردار کی تشکیل ہوتی ہے۔ خیال کی ندی کا وہ پہلا چشمہ جو ہمارے مرکز انا سے پھوٹتا ہے اور جس سے عمل و کردار کی ساری لہریں اٹھتی ہیں، اس پہ رائے عام کو بھی تصرف حاصل نہیں ہے۔

باہر سے ایک مدد ہمیں نفسیاتی تجزیہ کاری کے فن سے ملتی ہے۔ نفسیاتی تجزیہ کار ہماری ذہنی سرزمین کی کھدائی کر کے بگاڑ کے کسی خاص بیج اور فتنہ کی کسی ایک جڑ کی نشاندہی تو کر سکتا ہے، مگر وہ اصلاح کے لیے ہمیں مضبوط ایمانی جذبے اور انقلابی درجہ کی قوت ارادی سے مالا مال نہیں کر سکتا۔

یہ سارے عوامل و ذرائع اپنی جگہ بہت مفید اور ضروری ہیں، لیکن یہ ہماری اپنی ابتدائی ذمہ داری کو کم نہیں کر سکتے۔ انسان کی خودی جب تک خود ہی بیدار ہو کر شخصیت و کردار کی تعمیر اور برائی کے حملوں سے اسے بچانے کا عزم نہ باندھ لے، کوئی قانون، کوئی وعظ، کوئی درس، کوئی نفسیاتی تجزیہ، کوئی نظام تزکیہ اور کوئی تربیت گاہ آدمی کو صحیح آدمی نہیں بنا سکتی۔ اپنا شعور اگر سویا رہے اور اپنی قوت ارادی اگر سن ہو رہی ہو تو خارج کی ساری تدابیر آہستہ آہستہ بے جان اور غیر موثر ہو جاتی ہیں۔ ذرا کے اندر کا مزکی و مربی اگر مر گیا ہو تو باہر کے مزکیوں اور مربیوں کی تلقینات محض موجب سمع خراشی ہوتی ہیں جن کو سن کر تفکر و تدبر پیدا ہونے کے بجائے الٹا اونگھ طاری ہونے لگتی ہے اور باہر سے عائد کردہ بہترین اعمال بھی بے جان معمولات و عادات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

اصلاح نفس کا نقطۂ آغاز پس اسلام کو جس طرح اور جس حد تک میں نے سمجھا ہے اس کی رو سے

اصلاح کا نقطۂ آغاز آدمی کا یہ احساس ذمہ داری ہے کہ اپنے بھلے اور بُرے یا اپنی اصلاح اور اپنے بگاڑ کا ذمہ دار میں خود ہوں جس دن یہ احساس انگڑائی لیتا ہے اس دن انقلاب سیرت کا آغاز ہو جاتا ہے اور جب تک یہ احساس سُن ہوا رہتا ہے، ایمان و اخلاق کے لحاظ سے آدمی پستی کے گڑھے میں پڑا کروٹیں لیتا رہتا ہے اور بیشتر یہ ہوتا ہے کہ ساری عمر اسی حالت میں برباد ہو جاتی ہے۔ آخری لمحے آدمی کی روح پشیمان فریاد کرتی ہے کہ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ۔

شیطانی قوتیں اس احساس ذمہ داری کو سُلا رکھنے کے لیے بڑے جتن کرتی ہیں۔ وہ نفس کو کئی اقسام کے ملتی مشروب پلاتی ہیں اور افیون گھول گھول کر بڑے خوشنما پیالوں میں پیش کرتی ہیں۔ جب تک یہ احساس افیون زدہ رہتا ہے، آدمی اپنی لغزشوں، اپنی غلطیوں اور اپنے بگاڑ کی ذمہ داری دوسروں پر ڈالتا رہتا ہے۔ سارے قصور اسے دوستوں، ساتھیوں، نگرانوں، جماعتی رفقاء، معاشرتی ماحول اور سیاسی نظام ہی میں نظر آتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ان خطوط پر سوچتا رہتا ہے کہ اگر فلاں ایسا نہ کرتا تو میں پستی میں نہ گرتا، اگر یوں نہ ہوا ہوتا تو میں وہ اور وہ اچھائی پا لیتا، اگر حالات ایسے اور ایسے نہ ہوتے تو مجھے موجودہ روش اختیار نہ کرنی پڑتی۔ اسی ذہن کے ساتھ دنیا کا ہر مجرم سوچتا ہے۔ اور وہ قتل اور چوری اور جیب تراشی اور زنا کے جرائم کا ارتکاب کرنے کے بعد ان کی ذمہ داری خارج میں کسی دوسرے کے سر ڈالتا ہے۔

احساس ذمہ داری کے سُن ہونے کی صورت میں دوسری سمت آدمی اپنی اصلاح و تعمیر کا مطالبہ تمام تر دوسروں سے کرتا ہے۔ وہ بظاہر اس بات کا حریص بنتا ہے کہ مجھے نیک ہونا چاہیے اور میری سیرت کو بڑے اعلیٰ معیار پر پہنچنا چاہیے، مگر ساتھ ہی وہ چاہتا یہ ہے کہ دوسرے لوگ معمار بن کر اس کی شخصیت کی عمارت کو اٹھائیں۔ دوسرے ہی اینٹیں ڈھوئیں، دوسرے ہی گارا بنائیں، دوسرے ہی ردّے رکھیں اور وہ کھڑا دیکھتا رہے کہ اس کی زندگی کا حسین و جمیل قصر تیار ہو رہا ہے۔ دوسرے اس سے اخلاقی تقاضے منوائیں، دوسرے اس کے اندر شعور ابھاریں۔ دوسرے ہی اس کی

قوتِ ارادی کو پاؤں پر کھڑا کریں اور دوسرے ہی اسے اچھے اعمال پر مجبور کر دیں۔ کوئی حلقۂ درس اس کے اندر قرآن کی محبت بھر دے، کوئی تربیت گاہ اس کی نماز میں روحِ خشیت ڈال دے، کوئی اجتماع اس کے جذبۂ ایثار کو روبعمل لے آئے۔ کوئی اسے اونچی فضاؤں میں اڑا لے جائے۔

پھر جب کہ اس کے مطالبے پورے نہیں ہوتے تو وہ سوچتا ہے کہ کہیں کوئی خرابی ہے، درس و تلقین میں کوئی خرابی ہے۔ کسی نظامِ تربیت میں کوئی کوتاہی ہے، کسی تنظیم میں کوئی قصور ہے، کسی طریق کار میں کوئی تعطل ہے۔ نظامِ مساجد میں فتور ہے، طبقۂ علماء میں بگاڑ ہے، مدرسے سے نظریۂ دین میں کمزوری ہے یا اسلام وقت سے پیچھے رہ گیا ہے۔ وہ ہر جگہ خرابی تلاش کرتا ہے اور پا لیتا ہے مگر اسے اپنے اندر کی خرابی کا پتہ نہیں چلتا۔ اسے معلوم نہیں کہ اس کے اندر کا انسان دنیا و مافیہا سے غافل پڑا سو رہا ہے۔ وہ پریشان ہو ہو کر اپنی کوتاہیوں کا الزام دوسروں پر ڈالتا ہے، وہ بڑی مہارت سے تنقید کرتا ہے اور اس کی تنقید بڑی دلچسپ شان کی ہوتی ہے کہ جو کوتاہی خود اس کے اندر سب سے بڑھ کر پائی جاتی ہے اسی کی نشاندہی وہ دوسروں میں کرتا ہے۔ وہ اگر اخلاقی ارتقا میں خود سست رو ہوگا تو وہ دوسروں کی سستیٔ ارتقاء پر گرفت کرے گا، وہ اگر خود تشدد پسند ہوگا تو دوسروں پر تشدد کا الزام تھوپے گا۔ وہ اگر خود دین کے معاملات میں عدمِ انضباط کا شکار ہوگا تو دوسروں کی ہر بھول چوک پر خیانت کا لیبل لگائے گا۔ اس کا اپنا معیارِ زندگی اگر مسرفانہ ہوگا تو وہ دوسروں کی معتدل روش کو بھی مبالغہ آمیز طریق سے تبذیر کے زیرِ عنوان رکھے گا۔ وہ خود اگر بعض دینی تقاضوں کو پورا کرنے میں ڈھیلا پڑ گیا ہو تو عین انہی تقاضوں کے بارے میں دوسرے بہتر لوگوں کو ناکارہ ثابت کرے گا، وہ اگر خود مصالح کے نام پر بڑے بڑے اصولوں میں لچک پیدا کر لیتا ہو تو دوسروں کو بے اصول ثابت کرنے پر پورا زورِ نطق صرف کر دے گا، وہ جب خود ہاتھ پاؤں توڑ کے بیٹھ جائے گا تو ساری دنیا کے تعطل کا ماتم کرے گا، وہ جب خود وہ للہیت کا عالم گنوا چکے گا تو دوسروں کے اندر کی روحِ اخلاص کی بربادی کا نوحہ کہے گا اور وہ خود جس مرحلے پر آ کر اعلیٰ نصب العین کے لیے ادنیٰ ذاتی قربانی دے کر دوسروں سے فراخدلانہ تعاون کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھے گا تو دوسروں کی تنگ دلی

اور بے لحاظی کا دکھڑا سنانے لگا تھا کہ وہ جبریہ کے فلسفہ کی آڑ لے کر اپنے بگاڑ کا ذمہ دار خدا تک کو قرار دے لیتا ہے۔

انسان اپنا کیس بڑی خوبی اور مہارت سے مرتب کرتا ہے۔ وہ ہزار جرائم کا ذمہ دار ہونے کے باوجود ایک مظلوم مدعی بن کے انسانیت کی عدالت میں آتا ہے۔ اور نہ جانے کس کس کو مدعی علیہ بنا کر مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیتا ہے۔ وہ خود ہر حال میں مجبور اور بے بس ہوتا ہے اور دوسرے لوگ ہر حال میں اس کی لغزشوں اور وحشتوں اور نامعقول حرکتوں کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس کے پاس اپنے لیے بڑے الاؤنس ہیں، بڑی رعائتیں ہیں، بڑی چھوٹ ہے۔ بڑی عفو کاریاں ہیں، مگر دوسروں کے لیے اس کے جذبات کا حملہ بھی سنگین ہوتا ہے، اس کی زبان بھی بڑی درشت ہوتی ہے، اس کا استدلال بھی بڑا زوردار ہوتا ہے اور اس کی کسوٹیاں اور معیارات بھی بڑے کڑے ہوتے ہیں۔ انسان عالم فریبی ہی کا نہیں، خود فریبی کا بھی استاد واقع ہوا ہے۔ مگر یہ ساری عالم فریبیاں اور خود فریبیاں اسی دنیا تک ہیں، آخر کار اسے اس مقام پر پہنچنا ہے جہاں کوئی فریب نہ چلے گا اور سارے فریبوں کی قلعی کھل جائے گی اور اسے اپنے نفس کا ذمہ دار آپ ہوتے ہوئے جوابدہی کرنی ہوگی۔

یہ سارے احوال و کوائف اور یہ گوناگوں نفسیاتی تجربے جن سے آدمی گذر رہا ہوتا ہے، محض اس امر کی علامت ہیں کہ اس کے اندر اس کا جو مصلح ودیعت کیا گیا ہے وہ سو رہا ہے۔ اس کا احساس ذمہ داری سُن پڑا ہے۔

اسی باطنی مصلح طاقت کو بیدار کرنے کے لیے دعوتِ انبیاء گونجتی ہے کہ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔ وہ کہتی ہے کہ ہر فردِ انسانی نے جو کچھ خیر اپنے لیے سمیٹا وہی کچھ اس کے پلے پڑنے والا ہے اور جو کچھ شر اس نے فراہم کیا، اسی کا وبال اس کو بھگتنا ہے۔ دوسروں کی بھلائی اس کی برائی کا ازالہ نہیں کر سکتی اور دوسروں کی برائیاں اس کی بھلائی کو ملیا میٹ نہیں کر سکتیں۔ یہاں کا قانون یہ ہے کہ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ ہر ایک کا اپنا اپنا کھاتہ الگ الگ کھل رہا ہے۔ آخرت کے بنک میں جو کچھ کسی کا جمع ہے اسے کوئی دوسرا جعلی چیک

پر برآمد نہیں کرا سکتا اور جس کا کھاتہ خالی ہے وہ کسی دوسرے کے کھاتے سے کوئی حساب منتقل نہیں کرا سکتا۔ آدمی کی سیرت کی تجوری میں وہی مال داخل ہوتا ہے جو خود اس نے اپنی محنت سے کمایا ہو، دوسروں کی کمائی اس کے سرمائے میں کچھ اضافہ نہیں کر سکتی اور نہ دوسروں کے بہی کھاتوں پر تنقید کر کرکے وہ کوئی حصہ اخذ کر سکتا ہے۔ یہی حق ہے جسے قرآن نے یوں بھی بیان کیا ہے کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی جو کچھ خود بوؤ گے وہی کاٹو گے۔

ذمہ داری کی حس جس دن چونک اٹھتی ہے تو آدمی اُس دن زندگی کی کھیتی کو زرخیز بنانے کے لیے ایک کسان کی طرح پھاوڑا کندھے پر ڈال کر نکل کھڑا ہوتا ہے۔ وہ اپنی شخصیت کے چٹیل میدان میں ہل چلاتا ہے، وہ مستحکم عادات کے ٹیلے توڑتا ہے، وہ باطل تصورات کی جھاڑیاں اکھیڑتا ہے، وہ الہامی تعلیم کا پانی دیتا ہے، وہ حسنِ نیت کا بیج بوتا ہے ـــــ یہاں تک کہ کردار کی ایک فصل لہلہانے لگتی ہے اور آہستہ آہستہ اس پر سعادت و کرامت کے برگ و بار آتے ہیں۔ پھر جب فصل تیار ہو کر آخرت کے کھلیان میں پہنچتی ہے اور اس کی گہائی ہو جاتی ہے تو وہ حیاتِ دوام کے لیے مٹکے بھر لیتا ہے۔

انبیاء کی سعیٔ اصلاح کا اصل ہدفِ مقصود اسی احساسِ ذمہ داری کو چونکانا اور جھنجھوڑنا اور بروئے کار لانا ہے۔ یہ جاگ جائے تو پھر قسمت جاگ اُٹھتی ہے۔ یہ سوتی رہی تو سرے سے تقدیرِ انسانی سوئی رہتی ہے۔ اس حس کو جگانے کے لیے کائنات میں بے شمار دلائل و مظاہر کام کرتے ہیں، اس کو جگانے کے لیے طبعی واقعات اور نفسیاتی حوادث بڑی خدمت سرانجام دیتے ہیں، اور اسی مسافرِ ازل کو فرض کے راستے پر گامزن کرنے کے لیے الہام کا جرس بجتا ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے، دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگی عبارت ہے تیرے جینے سے

پس جس شخص کے اندر یہ حس کام کرنے لگے کہ میں اپنے بھلے اور بُرے کا خود ذمہ دار ہوں اور خود مجھے اپنے دل کو زندہ رکھنا ہے، خود مجھے اپنے دماغ کو اچھے خیالات کا گہوارہ بنانا ہے، خود مجھے

اپنی روح کو بالیدگی دینی ہے، خود مجھے اپنے کردار کو سنوارنا اور اپنی زندگی کو شیطانی حملوں سے بچانا ہے۔ اسی کے لیے خدا کی توفیق، مدد اور نصرت حاصل ہوتی ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ جو لوگ خدا کی درگاہ کی طرف بڑھنے کا عزم باندھ کر چل کھڑے ہوتے ہیں، انہی کو خدا کی طرف سے رہبری بھی فراہم کی جاتی ہے۔ یہ احساسِ ذمہ داری جب زندہ ہوگا تو سیرت میں مُعارِ ارتقا ہونے لگے گا اور جب اس پر اونگھ طاری ہوگئی، ترقی رُک جائے گی۔ سو ہمیں ہر آن یہ دیکھنا چاہیے کہ سینے میں دل زندہ ہے یا نہیں اور دلِ زندہ کب بیدار اور چوکس ہے اور کب وہ اونگھنے لگا۔ دل جب زندہ و بیدار ہوتا ہے تو آدمی یوں سوچتا ہے کہ میرا فرض کیا ہے اور میں نے کیا کوتاہی کی، لیکن جب یہ مر جاتا ہے یا سو جاتا ہے تو آدمی ساری توجہ اس پر صرف کرتا ہے کہ دوسروں کی ذمہ داریاں کیا ہیں اور ان سے کیا کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں۔

اپنے مرتبہ و مقام کا صحیح شعور

میرا ایک حاصلِ مطالعہ یہ ہے کہ انسانی کردار کی اساس اپنے مرتبہ و مقام کے صحیح شعور پر ہے۔ آدمی اپنے لیے اگر غلط مرتبہ و مقام تجویز کرے تو اس کی زندگی عیال کی ننھی سی کونپل سے لے کر اعمال کے اہم ترین برگ و بار تک اور نجی سرگرمیوں سے لے کر بین الاقوامی مشاغل تک ساری کی ساری بگڑ جاتی ہے۔ وہ اصلاح یافتہ اسی صورت میں ہوتا ہے جبکہ وہ اپنے آپ کو صحیح مرتبہ و مقام پر رکھتا ہے۔ کائنات کی محفلِ وجود میں جب تک وہ اپنی مقررہ نشست کو تلاش نہیں کر لیتا وہ آوارہ و پریشان رہتا ہے۔ یہ نشست پا لیتا ہے تو ٹھہراؤ اور توازن حاصل کر لیتا ہے۔

اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے انسان کو شعوری طور پر اس کے صحیح مرتبہ و مقام سے آگاہ کیا ہے۔ اسلام کے دیئے ہوئے علمِ حقیقت کے رُو سے آدمی خدا، اپنے ابنائے نوع اور مادی کائنات کی مثلث میں صحیح جگہ اس شعور کے ساتھ پاتا ہے کہ :-

— خدا کے سامنے اس کا مقام عبدیت کا مقام ہے۔

— اپنے ابنائے نوع کے ساتھ اس کا رشتہ اخوت و مساوات کا رشتہ ہے

—— اور، مادی کائنات پر وہ خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے حکمران و متصرف ہے۔ خدا کے سامنے اپنے مقامِ عبدیت کو پہچان لینے کے بعد کبر، غرورِ علم و قوت اور ظلم و تشدد کے رجحانات کے وہ دروازے بند ہو جاتے ہیں جو انسانیت کو تباہی و ہلاکت کی طرف لے جاتے ہیں۔ عبدیت کا اشتراک تمام انسانوں میں جس رابطۂ اخوت کو استوار کرتا ہے وہ نسلی، جغرافی اور طبقاتی اُونچ نیچ اور باہمی کشاکش کا سدِباب کرتا ہے۔ مادی کائنات، اس کے عناصر و قواء، فطرت کے فراہم کردہ مسائل کار اور دولت اور ضروریاتِ زندگی کے مقابلے میں انسان جب خلیفۃ اللہ کا منصب اختیار کرتا ہے تو تمدن گریز رہبانیت کا سدِباب بھی ہوتا ہے اور آدمی کی عزتِ نفس بھی بے جا تذلل سے محفوظ ہو جاتی ہے جس کی بنیاد پر سارا احساسِ ذمہ داری کھڑا ہوتا ہے۔

اس مرتبہ و مقام سے انسان جب کبھی آگے بڑھ کر استکبار کے راستے سے خداوندی کے دائرے میں قدم رکھ دیتا ہے تو بھی اس کا کردار غارت ہو جاتا ہے اور اس سے اگر وہ نیچے گر کر اپنے جیسے انسانوں اور مادی مظاہر اور دولت اور مشین کی طاقت کو معبود بنا لیتا ہے تو بھی اس کی سیرت پستی کے حوالے ہو جاتی ہے۔

انسان کو اُس کے اس صحیح مرتبہ و مقام کا علم و شعور تو باہر سے دیا جا سکتا ہے مگر اسے صحیح مرتبہ و مقام پر کھڑا کرنا اور پھر مدت العمر اس پر قائم رکھنا کسی خارجی وسیلے کا مرہونِ منت نہیں ہو سکتا۔ اس مرتبہ و مقام پر کھڑے ہو کر اپنی سیرت کی ترازو کی ڈنڈی سے پکڑ کر تھامے رکھنا اور ہر ہر آن یہ اہتمام کرنا کہ نہ اس کا پلڑا استکبار کی جانب جھکے، نہ تذلل کی جانب، بڑا امتحان ہے۔ دین کی ساری تعلیمات، اخلاق کے سارے ضابطے اور قانونِ شریعت کے سارے اوامر و نواہی اسی ترازو کی قسطاسِ مستقیم کو برقرار رکھنے کے لیے ہیں۔ مگر اسے تھامنے والا ہاتھ اور اس کی نگرانی کرنے والی آنکھ کہیں باہر نہیں ہے بلکہ ہر آدمی کا اپنا ہی ہاتھ اور ہر آدمی کی اپنی ہی آنکھ اس کی ضامن ہے۔ اس وجہ سے زندگی کی اصلاح کی ذمہ داری ہمارے اپنے ہی اوپر عائد ہوتی ہے۔

نصب العین | یہ واضح ہے کہ ہم اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے کچھ خواہشات و ضروریات کے

زیر بار ہیں۔ اِن خواہشات وضروریات کو ہمیں چار و ناچار پورا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن محض اپنی خواہشات و ضروریات پوری کرنے میں لگ جائے تو اس کے اندر اخلاقی زندگی سرے سے کروٹ ہی نہیں لیتی اور کوئی روحانی بالیدگی پیدا نہیں ہوتی۔ اخلاقی زندگی ایسی ذمہ داریوں سے عبارت ہوتی ہے جن کو پورا کرنے کے لیے اپنی خواہشات کی کچھ نہ کچھ قربانی دینی پڑے۔ دوسرے لفظوں میں اخلاقی زندگی ایثارِ نفس سے شروع ہوتی ہے۔ خواہشات میں تمام تر انہماک ہمیں حیوانی زندگی دے سکتا ہے، لیکن اعلیٰ درجہ کی انسانی زندگی خواہشات کو کسی مقصد اعلیٰ پر قربان کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ گویا سیرت بنانے اور زندگی سنوارنے اور روحانی و اخلاقی ارتقا حاصل کرنے کے لیے انسان کے سامنے کوئی ایثار طلب نصب العین اور ذاتی مفاد سے بلند تر کوئی ہدفِ نگاہ ہونا چاہیے۔ بغیر اس کے نیکی، روحانیت، اخلاقی علو، تعمیرِ کردار اور اصلاحِ نفس کا کوئی امکان نہیں۔ نصب العین اور ہدفِ نگاہ جتنا کم تر اور محدود تر یا بلند تر اور وسیع تر ہو گا اسی کے مطابق انسانی سیرت و کردار میں بھی بلندی و پستی اور وسعت و محدودیت پائی جائے گی۔ وہ شخص جو جانور کی طرح فقط اپنے چارے پانی اور تھانو سے اور جوڑے کی طلب میں سرگرم رہتا ہے اس کے اندر سیرت و کردار نام کی کوئی چیز نہیں پائی جا سکتی۔ اس سے بڑھ کر وہ افراد ہیں جو خاندان، قبیلے، نسل، قومیت، وطن، طبقے یا کسی خاص تنظیم یا جتھے کا مفاد سامنے رکھ کر ایثارِ نفس کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے اندر ایک محدود نوعیت کا کردار تشکیل پاتا ہے۔ لیکن اسلام نے ہمارے سامنے ساری انسانیت کا مشترک اور وسیع ترین مفاد بطورِ مقصد سامنے رکھا ہے اور ساری نگاہیں رضائے الٰہی پر مرتکز کی ہیں۔ اسلام کے اس عظیم نصب العین کو صحیح طور پر اپنا لینے سے عظیم درجے کا کردار تشکیل پاتا ہے۔ اس نصب العین سے بڑھ کر کوئی دوسرا نصب العین ایثارِ نفس نہیں مانگتا۔ یہ قیمت میں سب سے بڑھ کر گراں بہا ہے۔

ہر نصب العین آدمی کے سامنے کچھ اصولوں اور تقاضوں کو فرض بنا کر رکھتا ہے۔ ہر فرض خواہشات کے مقابلے پر آکر قربانی مانگتا ہے۔ فرائض اور خواہشات کے درمیان کشمکش ہوتی ہے

اور یہ کشمکش زندگی کو ایک امتحان بنا دیتی ہے ؎

عرصۂ عالم میں تیرا امتحان ہے زندگی

اس کشمکش اور حالتِ امتحان میں پڑ کر آدمی کو بار بار ہر آن فیصلے کرنے پڑتے ہیں اور ان فیصلوں کو نبھانا پڑتا ہے۔ امتحان میں پڑنا اور صحیح فیصلے کرنا اور پھر ان کو نبھانا جوہرِ کردار کو نشو و نما اور جِلا دیتا ہے۔ جیسے کہ سونا بار بار کٹھالی میں پڑ کر کندن بنتا ہے۔

کوئی نہیں جو حالتِ امتحان کا احساس باہر سے آدمی پر ٹھونس سکے، کوئی نہیں جو کشمکش کی ذمہ داری خارج سے تسلیم کرا سکے، کوئی نہیں جو فرض و خواہش کے کسی معرکے میں آدمی کے باطن میں ہونے والے فیصلے کو سمجھ سکے اور اس کو زبردستی صحیح راستے پر ڈال سکے اور کوئی نہیں جو کسی اخلاقی فیصلے کو وفاداری سے نبھانے پر بیرونی دباؤ سے آدمی کو مجبور کر سکے۔

عمر بھر کے اس معرکۂ خیر و شر میں صرف وہی شخص بازی مار لے جا سکتا ہے جو ایک سپاہی کا سا جذبہ اپنے اندر رکھتا ہو، ایک سنتری کی طرح اپنے اصول و فرائض کا پاسبان بنے اور ایک پہلوان کی طرح سفلی میلانات سے کشتی لڑتا رہے۔ جس شخص کے اندر کا سپاہی ہتھیار پھینک چکا ہو، جس شخص کے اندر کا سنتری سو گیا ہو اور جس شخص کے اندر کا پہلوان بے حس و حرکت ہو گیا ہو وہ زندگی کا کھیل ہر چکا۔ کوئی دوسرا اس کے حصے کی جنگ نہیں لڑ سکتا اور کوئی دوسرا اس کی جگہ پہرہ نہیں دے سکتا۔ کسی نصب العین کا قطعی طور پر انتخاب کر لینا۔ اس پر ہمیشہ اپنی نگاہ مرتکز رکھنا، اس کے عاید کردہ فرائض کو اپنے لیے واجب قرار دینا، اس کے تقاضوں کے تحت اپنی خواہشات کی قربانی دینا، اس کی پیدا کردہ کشمکش میں مجاہدانہ انداز سے اقدامات کرنا اور ہر قدم پر مضبوطی سے جمے رہنا خود ہمارا کام ہے، دوسروں کا نہیں!

جو شخص اسلام کو زندگی کا رہنما بناتا ہے وہ گویا اپنے لیے بلند ترین نصب العین طے کر لیتا ہے، وہ اپنے لیے بے شمار فرائض متعین کر لیتا ہے، وہ اپنے اوپر حدود و قیود عاید کر لیتا ہے، وہ ایثارِ نفس کے مواقع سے آگاہ ہو جاتا ہے، وہ اپنے آپ کو ایک امتحان گاہ کشمکش میں لا کھڑا کرتا ہے

اب وہ کیوں یہ چاہتا ہے کہ روز بروز کوئی اسے بتائے کہ تو مسلم ہے، بار بار اسے نئے سرے سے سمجھائے کہ تیرا نصب العین اب رضائے الٰہی ہے، نت اس کے فرائض کی فہرست اس کے سامنے پڑھتا رہے کہ ان کو تجھے پورا کرنا ہے اور ان کے لیے قربانیاں دینی ہیں۔ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر یقیناً ایک اسلامی نظامِ جماعت کی لازمی شان ہے اور ایک نصب العین کے فدائیوں کی رفاقتِ باہمی کا تقاضا بھی ہے کہ وہ بار بار تلقینِ حق کریں، ہمیشہ تذکّر کی فضا آراستہ رکھیں، لیکن اگر ہر شخص اپنی استقامت اور راست روی اور اصلاح کا دار و مدار دوسروں پر رکھے اور اور اپنی ذمہ داری آپ پوری نہ کرے تو سرے سے تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا ماحول ہی نہ بن سکے گا۔

ضابطہ و معیار کا علم نیک بننے کے لیے نیکی کا مبہم تصور کافی نہیں۔ سیرت و کردار کو سنوارنے کے لیے ایک واضح ضابطہ و معیار کا علم ہونا ضروری ہے۔ ہر دور، ہر خطے اور ہر قسم کے حالات میں افراد اور اقوام کے اندر بہتر زندگی حاصل کرنے، برائیوں اور خرابیوں سے بچنے اور تعمیر و ترقی کے راستے پر بڑھنے کی خواہش فطری طور پر موجود رہی ہے۔ لیکن بہتر زندگی حاصل کرنے کا راستہ بالعموم غیر واضح رہا ہے۔ جب کبھی راستہ غیر واضح رہا ہے، انسانی قافلے دھندلے قیاسات کے پیچھے پیچھے آوارہ گردی کرتے رہے ہیں۔ انسانیت صلاح و فلاح ایسے ہی کسی دور میں پا سکتی ہے جب کہ صلاح و فلاح کا واضح ضابطہ اسے ہاتھ آیا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کا احسانِ عظیم یہی ہے کہ انھوں نے نیکی اور صلاح و فلاح کے ضابطے کو وضاحت کے ساتھ انسانیت کے سامنے رکھا۔ اپنی آخری اور مکمل شکل میں یہ ضابطہ قرآن نے پیش کیا ہے۔

ضابطہ کے ساتھ انسان ہمیشہ اس امر کا محتاج ہی رہا ہے کہ اس ضابطے کے مطابق انسانی زندگی کا عملی نمونہ اس کے سامنے رہے۔ وہ ہدایت حاصل کرنے کے لیے کسی تجریدی فلسفے سے زیادہ کسی عملی مظاہرے سے استفادہ کرتا ہے۔ وہ محض منطقی دعوت و استدلال سے انقلابی

روح اخذ نہیں کر سکتا بلکہ اسے ایسی حکمت درکار ہے جس کے ساتھ عملی تعبیر موجود ہو۔ وہ ایسی منطق چاہتا ہے جو واقعات کے پیرائے میں جلوہ گر ہو۔ وہ ایسے استدلال کا ضرورت مند ہے جس کے اندر انسانی جذبات کی گھلاوٹ ہو۔ دوسرے لفظوں میں وہ مجرد ایک کتابی ضابطے سے مطمئن نہیں ہوتا، اسے چلتا پھرتا پیکرِ محسوس درکار ہے جو اس کتابی ضابطے کو انسانی زندگی میں کارفرما دکھائے۔ اسے ایک اسوہ و معیار کی ضرورت ہے۔ یہ اسوہ و معیار رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستیٔ انور ہے۔

تجربہ گواہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے دوستوں، حلقہ ربط و تعاون، سوسائٹی کے ممتاز شہرت یافتہ افراد اور تاریخی شخصیتوں میں کہیں نہ کہیں اپنے لیے اُسوہ و معیار رکھتا ہے اور پھر اپنے اخلاقی اصول بنانے میں، روزمرہ زندگی کے اقدامات کرنے میں، بات چیت اور رفتار و گفتار کے اسلوب میں، حتیٰ کہ لباس کے انتخاب اور وضع قطع بنانے میں غیرشعوری اور شعوری طور پر اپنے اسوہ و معیار کی پابندی کرتا ہے۔ کچھ خاص ادائیں، کچھ خاص حرکات، کچھ خاص الفاظ اور ان کے لیے خاص لب و لہجہ اور اسی طرح خوشی اور غم، غصے اور رحم، نفرت اور محبت کے کچھ انداز ہم خاص خاص شخصیتوں سے مستعار لیتے ہیں۔ اب جیسا جیسا اُسوہ و معیار کسی نے سامنے رکھا ہوتا ہے اسی طرز کا کردار اس کے اندر پروان چڑھتا ہے۔ کسی کے سامنے ایک فلمی ایکٹر کا کردار ہوتا ہے۔ کسی کے سامنے ایک ناول کا ہیرو ہوتا ہے، کسی کے سامنے کوئی شاعر یا ادیب ہوتا ہے، کسی کے سامنے کرکٹ یا ہاکی کا کوئی کھلاڑی ہوتا ہے، کسی کے سامنے محکمے کا کوئی افسر، پارٹی کا کوئی لیڈر یا ملک کا کوئی وزیر ہوتا ہے۔ بسا اوقات ہمارے متعدد معیارات مختلف اطراف میں بکھرے ہوئے ہوتے ہیں اور ہم مختلف پہلوؤں سے بہت سی شخصیتوں کی تقلید بیک دم کر رہے ہوتے ہیں۔ اسلام نے یہ چاہا ہے کہ ہم اپنی پوری اخلاقی زندگی کے لیے سرورِ عالمؐ کی ایک ہی بے داغ اور بے مثل شخصیت کو اسوہ و معیار بنائیں اور سارا انتساب وہیں سے کریں۔ انسانی کردار کے لیے یہی سب سے اونچا مقام ہے جس پر نگاہ جما کر بلند ترین پرواز کی جا سکتی ہے۔

اس معیارِ سیرت و کردار کی سنّت کا مستند ریکارڈ اس کی پوری تصویر ہمارے سامنے لا رکھتا ہے اور ہماری تاریخ کا ایوان اس کی لازوال روشنی سے جگمگا رہا ہے۔

اسلام کے پیش کردہ ضابطہ و معیار کو ہم قرآن و حدیث سے معلوم کر سکتے ہیں۔ قرآن و حدیث کا علم ہی وہ العلم ہے جس کی طلب ہر مسلم مرد و عورت کے لیے فرض ٹھیرائی گئی ہے۔ اس العلم کے حصول کے لیے مرتبۂ اوّلین یہ ہے کہ آدمی عربی زبان سیکھے اور براہِ راست استفادہ کرے۔ یہ نہیں تو تراجم اور تفاسیر موجود ہیں ان سے مدد لے۔ حلقہ ہائے درس اور تقاریر سے فائدہ اٹھائے۔ لیکن اس علم کی طلب کسی میں کتنی ہے کتنی نہیں، یہ بات خود اس کے اپنے اوپر انحصار رکھتی ہے اور یہ امر بھی آخر کار لوٹ کر اسی کے اوپر آتا ہے کہ وہ حاصل شدہ علم کے مطابق کہاں تک اپنے آپ کو سدھارتا ہے۔ اس علم کی پیاس اگر موجود نہ ہو تو چاہے اس کے فوارے ہر طرف کیوں نہ چھوٹ رہے ہوں، ایک آدمی جاہل پڑا رہے گا اور اگر اس کے اندر عملی لحاظ سے جمود پیدا ہو گیا ہے تو چاہے علم اس کے اندر خارج سے ٹھنس بھی کیوں نہ رہا ہو اس کے حق میں بالکل بے نتیجہ رہ جائے گا۔

یہ فرد فرد کا اپنا کام ہے کہ وہ اپنے اندر ضابطہ و معیار کے علم کی پیاس برقرار رکھے اور حاصل شدہ علم کے مطابق عمل و کردار کی اصلاح کی مہم جاری رکھے

ایک عزم ___ ایک فیصلہ اگر ہم انسانی نفسیات کا گہرا جائزہ لیں تو چاہے زندگی کا کوئی کلی اور ہمہ گیر انقلاب ہو یا کوئی جزئی اصلاح، ہر تبدیلی ہمیشہ ایک عزم اور ایک فیصلے کا نتیجہ ہوتی ہے جب تک ایک مجاہدانہ عزم نہ باندھا جائے اور جب تک قوت ارادی اپنے پیروں پر کھڑی ہو کر ایک قطعی فیصلے کا اعلان نہ کر دے ہمارے اندر کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ بہت سی چیزیں ہیں جن کی ہم تعریف کرتے ہیں اور گفتگوؤں میں ان کو واجب العمل مانتے رہتے ہیں لیکن عملاً ان کو اختیار نہیں کرتے دوسری طرف بہت سی چیزوں کو ہم برا کہتے ہیں اور ان سے بچنے کو وجہ فلاح قرار دیتے ہیں لیکن ساری عمر وہ ہمیں چمٹی رہتی ہیں۔ یہ مجہول حالت محض اس وجہ سے ہم پر برسوں طاری رہتی ہے کہ

ہم ایک قطعی فیصلہ نہیں کر پاتے۔ بلکہ بیچ میں لٹکے رہتے ہیں۔ اصلاحِ نفس کی مہم شروع کرنے کے لیے درجۂ اوّل کی ضرورت یہ ہے کہ آدمی علم و شعور کے مطابق ہر معاملے میں قطعی فیصلہ کرنے اور عزمِ صمیم باندھنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرے۔

اسلام ایسا انسان تیار کرنا چاہتا ہے جو خدا اور رسول کا فرماں بردار بن کر دوسروں کی بھلائی چاہنے، دنیا میں متاعِ خیر کا اضافہ کرنے اور زندگی کو حُسن سے آراستہ کرنے کی مہم میں منہمک ہو جائے۔ اب اس طرز کا انسان وہی بن سکتا ہے جو یکبارگی یہ قطعی فیصلہ کرلے کہ آج سے میں کسی کے ساتھ بُرائی کرنے کے لیے نہ ذہن و دماغ سے سوچوں گا اور نہ اپنے اعضاء سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہونے دونگا، آج سے میں انسانیت کی متاعِ خیر میں اضافہ کروں گا اور اس متاع کے نقصان کا روادار نہ ہونگا، آج سے میں زندگی اور تمدن اور معاشرت کو حُسن دونگا اور اس میں بدنمائی پیدا کرنے میں کوئی حصہ نہیں لوں گا۔ سرکارِ دوعالمؐ کی دعوت پر جن ہستیوں نے لبیک کہی تھی انھوں نے ایسے ہی قطعی فیصلے کیے تھے اور ایسے ہی عزائم باندھے تھے۔ دنیا نے لالچ اور خوف کے سارے وسائل لے کر ان کے خلاف یورش کی مگر وہ اس دنیا سے اس شدّت سے ٹکرائے کہ اس کے نظام ہائے باطل کے پرخچے اُڑ گئے۔ کیا مثال ہو سکتی ہے اس شخص کی جس نے کھجوریں کھاتے کھاتے ایسا ہی قطعی فیصلہ کیا اور آن کی آن میں جہاد کے مورچے پر قربان ہو گیا۔

ایک ہم ہیں کہ دن رات دوسروں کی طرف سے پیش آنے والے جن تجربوں میں ناگواری محسوس کرتے ہیں اور ان کی برائی کا احساس ہوتا رہتا ہے ان سے خود باز نہیں آسکتے۔ بسوں پر جو شر ہونگ ہوتی ہے، سڑکوں اور گلیوں میں جو غلاظت پھینکی جاتی ہے، بول چال میں زبانوں کی گندگی اور جذبات کی جو تلخی سامنے آتی ہے، نظربازی اور فقرہ بازی میں جس کمینگی کا مظاہرہ ہوتا ہے اس سے کسے کرب محسوس نہیں ہوتا۔ مگر ہم خود شر ہونگ مچاتے ہیں، ہم خود غلاظت پھینکتے ہیں، اور اپنی نگاہوں اور زبانوں پر ہم خود قابو نہیں رکھ سکتے۔

کردار وہ لوگ بنا سکتے ہیں جو جب جس برائی کا احساس کریں کہ یہ موجبِ آزار ہے تو اس آن

اپنے ذہن میں عزم باندھیں کہ بس اس لمحے سے میں نے اسے چھوڑا۔ اس کی زریں مثال مدینہ کی ان جوہردار ہستیوں نے پیش کی تھی جنھوں نے شراب کی حرمت کا حکم سنتے ہی ہونٹوں سے لگے ہوئے پیالے الگ کر دیئے یا پھر اُن خواتین نے مبارک اسوہ قائم کیا جنھوں نے حجاب کا حکم سنتے ہی کمرپٹے پھاڑ پھاڑ کر فوراً اوڑھنیاں بنالیں اور گھونگھٹ نکال لیے۔ جو شخص بُرائی کو بُرائی محسوس کر لینے کے بعد اس کو ساتھ لیے لیے چلتا ہے اور جو شخص ایک اخلاقی تقاضے کا شعور حاصل ہو جانے پر بھی اپنے اوپر اسے طاری نہیں کرتا، بلکہ "یہ ہونا چاہیے" اور "یہ نہ ہونا چاہیے"۔ "یہ اچھا ہے"، "یہ بُرا ہے" کے رٹے ہوئے جملے شاعرانہ انداز سے دُہراتا رہتا ہے اسے کوئی درس اور کوئی نظامِ تربیت اور کوئی خانقاہ اور کوئی جماعتی ماحول سنوار نہیں سکتا۔ وہ ذہنی جمود اور قلبی فالج کا مریض ہے۔ وہ ہمیشہ اس انتظار میں پڑا رہے گا کہ کوئی اسے پھونک مار کر یا ایک نگاہِ حقیقت ڈال کر کچھ بنا دے اور کوئی زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اخلاقی علو کے مرتبے پر پہنچا دے۔

نیکی کا مقام حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر معاملے میں واضح ارادہ باندھا جائے اور قطعی فیصلہ کیا جائے، فیصلوں کو اصول بنا لیا جائے اور اصولوں کو پائیدار روایات اور مستحکم عادات کی شکل میں ڈھال لیا جائے۔ ہر ارادے کو پورا کرنے، ہر فیصلے کو نبھانے، ہر اصول کا حق ادا کرنے اور عادات و روایات کا پابند رہنے میں قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ قربانیاں ہی ان کو قیمتی اور محبوب بناتی ہیں۔

شخصیت، عادات و روایات ہی سے بنتی ہے۔ فرد کی عادات اور قوموں، خاندانوں اور جماعتوں کی روایات بڑی آہنی طاقت ہوتی ہیں جو کسی خاص طرز کے کردار کی حفاظت کرتی ہیں۔ ایک طریقے پر بار بار عمل پیرا ہو کر ایک شخص اس میں اتنا مضبوط ہو جاتا ہے کہ اگر اسے اس کے خلاف کسی حرکت کو دعوت دی جائے تو وہ مجبورانہ انداز سے معذرت کرے گا کہ "ایسا تو میں ہرگز نہیں کر سکتا"۔ اسی طرح ایک خاص طرح کی اخلاقی روایات رکھنے والے خاندان یا معاشرے کے کسی فرد سے اگر ان روایات کے خلاف کسی اقدام کا مطالبہ کیا جائے تو وہ غیرت مندانہ انداز سے انکار کر دے گا کہ

"یہ میرے امکان میں نہیں ہے"۔

ایک علم کے سامنے ہر معاملے میں واضح اور طے شدہ اصول اور فیصلے ہونے چاہئیں کہ میں یہ اور یہ کروں گا اور یہ اور یہ نہیں کرونگا۔اس کے اعمال کی اٹل حدیں ہونی چاہئیں۔اس کے اندر نیکی کی مستقل عادات اور روایات قائم ہو جانی چاہئیں۔اسی لیے اسلام نے کبھی کبھار کے منفرق نیک اعمال کے مقابلے میں اس قلیل عمل کو ترجیح دی ہے جس پر آدمی مداومت اختیار کرے۔نیکی جو بھی اختیار کی جائے وہ آدمی کی سیرت کا ایک مستقل جزو بن جانی چاہیے۔

اب یہ بالکل واضح بات ہے کہ باطن میں فیصلہ کن عزم باندھنا،عزم کو اصول بنا لینا اور اصولوں کو عادات و روایات میں ڈھال لینا آدمی کے اپنے ہی اوپر منحصر ہے۔خارج کا کوئی مربّی و مزکّی یہ ذمہ داری سرانجام نہیں دے سکتا۔اس کے لیے اندر کے مربّی و مزکّی ہی کو جگانا پڑتا ہے۔

معرفتِ نفس

اپنی اصلاح و تعمیر بغیر اپنے آپ کو جانے ممکن نہیں۔اس کے لیے بڑی ضرورت اپنے نفس کو جاننا اور اس کی معرفت حاصل کرنا ہے۔معرفتِ نفس کے معنی یہ بھی ہیں کہ نفسِ انسانی کی فطرت کو جانا جائے اور حدیث کے مطابق اس کے لیے ملکوتی قوت اور اس کے مقابلے میں کام کرنے والی شیطانی قوت کے درمیان جو کشمکش رہتی ہے اس پر نظر رکھی جائے اور اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ خاص طور پر ایک شخص اپنے نفس کے انفرادی امتیازی احوال کو سمجھتا ہو۔

نفس کو اگر ہم ایک مزاجی کیفیت میں چھوڑ دیں کہ اس میں مختلف اچھی اور بُری قوتیں ایک دنگل مچائے رکھیں اور جب جو رجحان بھی زور پکڑ لے،زندگی اسی کے مطابق ڈھل جائے تو اسی مزاجی کیفیت کے ساتھ کسی اصلاح کا امکان نہیں۔سیرت بنانے کے لیے نفس کا ایک منظم سلطنت کی صورت اختیار کرنا ضروری ہے،جس میں تمام داعیات و رجحانات ٹھیک اپنے مرتبہ و مقام پر رکھے گئے ہوں اور ہر ایک کے لیے اس کی حدود معین ہوں۔

ہر اصلاح طلب آدمی کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ وہ اپنی خاص کمزوریوں کا شعور حاصل کرے۔بار بار کے تجربات سے ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہماری سیرت کا کمزور پہلو کیا ہے۔کسی

کے اندر کبر کا رنگ پایا جاتا ہے، کسی میں غصہ کی تلخی زیادہ ہوتی ہے، کسی میں خود داری کا مرض ہوتا ہے کسی کے جنسی میلانات میں عدم توازن پایا جاتا ہے، کسی میں اسراف یا بخل کے آثار ہوتے ہیں، کسی پر یاسیت کے حملے زیادہ ہوتے ہیں، کسی میں علیحدگی پسندی پائی جاتی ہے، اور کسی میں کچھ اور کمزوریاں ہوتی ہیں۔ اپنے اندر کی ایسی کمزوریوں کو جان لینا اور ان کے خلاف ایک جدوجہد جاری رکھنا سیرت کو سنوارنے کے لیے انتہائی لازم ہے۔ ورنہ اگر ہم اپنی کمزوریوں کو ڈھیلا چھوڑ دیں تو آخر کار وہ پورے کردار پر چھا جائیں گی۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ نفس اور ذہن اور روح کے مرکز پر کڑی نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے جس کا شریعت میں اصطلاحی نام قلب ہے۔ قلب ہی وہ سرچشمۂ اولین ہے جہاں سے خیال اور احساس اور جذبے اور ارادے کے جھرنے پھوٹتے ہیں۔ فساد جب اس سرچشمہ میں آتا ہے تو پھر سارے کردار میں پھیل جاتا ہے اور اصلاح بھی جب اس سرچشمہ کی ہوتی ہے تو ساری سیرت سنور جاتی ہے۔ قلب درست ہو تو یہی اصل مربّی و مزکّی، یہی بہترین مفتی اور جج اور چاق و چوبند پاسبان اور سنتری ہے۔ یہ بگڑ جائے تو پھر باہر کی کوئی امداد ہمیں سنوار نہیں سکتی۔

رسولِ اکرمؐ کی رہنمائی یہ ہے کہ ایک گناہ جب آتا ہے تو اسی قلب یا مرکزِ روح میں ایک سیاہ نقطہ نمودار ہوتا ہے۔ آدمی کی نگاہ اگر اس مرکز پر نہ لگی ہو اور وہ اس سیاہ نقطے کو فوراً دھو نہ ڈالے تو یہ نقطہ پھیلنے لگتا ہے، یہاں تک کہ اس کی سیاہی پورے قلب کو محیط ہو جاتی ہے۔ ابتدا میں ایک گندا خیال، ایک گھٹیا جذبہ اور ایک فاسد اقدام سیاہ نقطہ پیدا کرتا ہے۔ اس سیاہ نقطے کا اگر فوراً ازالہ نہ کر دیا جائے تو پھر یہ پھیلاؤ اختیار کر کے سارے نامۂ سیرت کو سیاہ بنا دیتا ہے۔ ایک بیدار دل مسلم اسے نمودار ہوتے ہی توبہ و ندامت کے آنسوؤں سے دھو دیتا ہے۔

اب یہ ظاہر بات ہے کہ اپنے نفس پر نگاہ رکھنا، اپنی کمزوریوں کو جاننا اور ان کے خلاف معرکہ آرا رہنا اور اپنے مرکزِ روح کی پاسبانی کرنا ہر ہر فرد کے اپنے ہی اوپر منحصر ہے۔ اس دائرے میں باہر سے کوئی دوسرا اس کے حصے کا فرض انجام نہیں دے سکتا۔ ہم دوسروں کی مدد کے کتنے بھی

محتاج کیوں نہ ہوں، جب تک "اپنی اصلاح آپ" کا اصول اختیار کر کے ہم اپنے حصے کی ذمہ داری پوری نہ کریں دوسروں کی مدد سے بھی ہمیں کوئی فائدہ نہیں حاصل ہو سکتا۔

رسائل و مسائل

اسلامی جمہوریت اور مغربی جمہوریت میں فرق

سوال :- قرآن میں صالح انسان کی خصوصیات درج ہیں اور امیر المومنین یا صدر ریاست اُسی شخص کو ہونا چاہیے جس میں یہ صفات موجود ہوں۔

(۱) اب سوال یہ ہے کہ یہ کون طے کریگا کہ اُس شخص میں یہ صفات بدرجۂ اتم موجود ہیں ؟ اور اگر کوئی طے بھی کر دے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ تنہا ایک شخص کا فیصلہ ہوگا اور جمہور کا نہیں ہوگا۔

(۲) اگر اس کے برخلاف صدر ریاست کے چناؤ کے لیے جمہور کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یعنی ملک میں عام انتخابات ہوتے ہیں تو یہ ایک جمہوری طریقہ ہے اور اس میں ہر شخص کے لیے موقع ہے، چاہے وہ صالح ہو یا نہ ہو۔ اگر ہم اس طریقہ کو تسلیم کرلیں تو یہ موجودہ جمہوری قاعدوں اور طرز کے مطابق ہوگا اور ہمارا مان لینا گویا تصدیق کرے گا کہ یہ اسلامی طرز عمل ہے۔

اب اگر اسلام ایسی ہی جمہوریت چاہتا ہے تو یہ جمہوریت تو ہمارے ملک میں موجود ہی ہے۔ پھر اسلامی دستور کا مطالبہ کیوں ہے ؟ جبکہ جمہوریت ان تمام نقائص کو پیدا کرتی ہے جو آج کل کی دنیا کے لیے اچھے ہو سکتے ہیں۔

جہاں تک دوسرے مروجہ قوانین کا تعلق ہے تو یہ کہاں تلقین کی گئی ہے کہ لوگ لاقانونیت برتیں اور دوسرے خراب کام کریں بلکہ ایسا کرنے والوں کے خلاف کارروائی کی جاتی ہے لہٰذا ثابت یہ ہوا کہ یہ سارا نظام صحیح ہے۔ اس لیے اس میں مزید تبدیلی چاہنے کا کیا جواز ہے ؟

جواب : جواب کے سلسلے میں آپ کے سوال کے آخری حصہ کے متعلق سب سے پہلے کچھ

عرض کرتا ہوں اور پھر اصل حصہ کے بارے میں کچھ گذارش کروں گا۔

گستاخی معاف ہو تو عرض کروں کہ آپ کا یہ استدلال کہ "جس نظام میں بھی لاقانونیت پر کسی قسم کی کوئی گرفت موجود ہو وہ اسلامی کہلانے کا مستحق ہے" بڑا عجیب ہے۔ لاقانونیت ایک اضافی شے ہے اور یہ ہر نظام کی ہیئت اور نظام کی ساخت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اس لیے صرف لفظ لاقانونیت سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں۔ دوسرے دو مختلف نظاموں میں کچھ چیزیں مشترک ہوتے ہوئے بھی وہ الگ الگ نظام ہوتے ہیں۔ کیا سرمایہ داری اور اشتراکیت میں کوئی چیز بھی مشترک نہیں ان دونوں نظاموں کی تفصیلات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بیشتر چیزیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں مگر اس کے باوجود ہم انھیں ایک نظام نہیں کہہ سکتے۔ دو مختلف نظاموں کا کسی ایک یا چند امور میں ایک دوسرے سے متفق ہو جانا کبھی بھی اُن کے ایک ہونے کی دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہی حال اسلام اور مغربی جمہوریت کا ہے۔

اس ضمن میں دوسری یہ چیز ذہن نشین رہے کہ آپ نے کسی چیز کو اسلامی ٹھہرانے کے لیے ایک طریق PROCESS کو اصل سمجھا ہے۔ حالانکہ کسی نظام کا اصل جوہر طریق نہیں بلکہ وہ اصولی و مقصدی رُوح ہوتی ہے جو اُس کے اندر جاری و ساری رہتی ہے اور اسی روح کے متعلق ہم حکم لگا سکتے ہیں۔ ان گذارشات کے بعد اب آپ مغربی جمہوریت اور اسلامی جمہوریت کے فرق پر غور فرمائیں۔

(۱) مغربی جمہوریت میں حاکمیت جمہور کی ہوتی ہے اور اسلام میں حاکمیت اللہ تعالیٰ کی تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مغربی جمہوریت میں کسی چیز کے حق و ناحق کا فیصلہ کرنے کا آخری اختیار اکثریت کو حاصل ہے، مگر اسلام میں یہ حق صرف باری تعالیٰ کو پہنچتا ہے جس نے اپنا آخری منشا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے دنیا پر واضح فرما دیا۔ یہ اختلاف کوئی معمولی نہیں بلکہ اس کی بنا پر دونوں نظام بنیادوں سے لے کر کاخ و ایوان تک ایک دوسرے سے مختلف ہو جاتے ہیں

(ب) اسلامی جمہوریت میں خلافت ایک امانت ہے جو ہر مسلمان کو سونپی جاتی ہے، اور تمام مسلمان محض انتظامی سہولت کے لیے اُسے ارباب حل و عقد کے سپرد کر دیتے ہیں۔ مغربی جمہوریت

میں اصحاب اقتدار صرف اپنی پارٹی کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلامی ریاست میں عوام کے نمائندے خدا اور خلق دونوں کے سامنے جواب دہ ہیں۔

(ج) آخر میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلامی نظام صرف ایک طریق انتخاب تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے سارے معاملات میں اپنا ایک مخصوص نقطۂ نظر اور زاویۂ نگاہ پیش کرتا ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو آخری سند مان کر اپنی پوری انفرادی اور اجتماعی زندگی کو ان کے مطابق ڈھالا جائے۔ پاکستان میں قرارداد مقاصد کے ذریعہ اسے تسلیم تو کیا گیا ہے مگر افسوس کہ اس کے نفاذ کے راستے میں ہر طرح کی رکاوٹیں ڈالی جا رہی ہیں۔

(د) کسی شخص کے صالح اور غیر صالح ہونے کا فیصلہ قیامت کی سرحد کے اس طرف تو سوسائٹی ہی کر سکتی ہے، کسی ایک شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا۔

مغرب سے اخلاق کا سبق

(نوٹ) مندرجہ ذیل سوال ایک ایسے کالج کے پروفیسر صاحب نے بھیجا ہے جہاں فرنگیت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ابھی تک نمایاں ہے۔ اصل سوال انگریزی میں ہے۔ یہاں اس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

سوال:۔ اسلام کے گن گاتے ہوئے آپ لوگوں کی زبانیں نہیں تھکتیں، حالانکہ ہم ہر روز اپنی آنکھوں کے سامنے یہ دیکھتے ہیں کہ اہل مغرب نے بغیر اسلام [illegible] ہوئے کس قدر حیرت انگیز ترقی کی ہے مغربی قوموں میں وقت کی پابندی۔ ایفائے عہد، محنت [illegible] بغیر خدا پر ایمان لائے ہوئے موجود ہے۔ اور آپ کی قوم خدا پر یقین رکھتے ہوئے بھی ان اوصاف سے عاری ہے۔ جب ہم خدا اور آخرت پر ایمان لائے بغیر اچھے اخلاق پیدا کر کے ترقی کر سکتے ہیں، تو کیوں نہ اسلام سے نجات حاصل کر کے مغرب کی پیروی میں ترقی کی راہ پر گامزن ہوں۔ اچھے اوصاف

پیدا ہو جانے کے بعد اسلام کو بھی اپنانا کسی قدر آسان ہو جائے گا

جواب :- آپ اپنی مرضی کے مختار ہیں جو چاہیں کریں مگر عقل اور مشاہدہ آپ کی رائے کی تائید نہیں کرتے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اخلاق تو مغرب سے لے لیا جائے اور اُسے ہم اپنے مخصوص حالات میں فٹ کر کے اُس سے اُن نتائج کی توقع کریں جو یورپ میں برآمد ہوئے ہیں۔ یہ فلسفہ "اخلاق برائے اخلاق"، "ادب برائے ادب" یا "نیکی برائے نیکی" کی طرح بھی یورپین فکر کی ایک دلچسپ بازیگری ہے۔ اہل مغرب، خود تو نہیں مگر اپنے مقلدین کو یہ ضرور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اخلاق صرف ایک شعبۂ زندگی ہے جس کو پوری زندگی اپنائے بغیر اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اخلاق کوئی موٹر کار یا کوئی لباس نہیں جیسے کوئی قوم یورپ سے امپورٹ کر سکتی۔ بلکہ دراصل یہ نام ہے اُن اصول و نظریات کے عملی ظہور کا جو یورپین اقوام نے اپنے نصب العین تک بڑھنے کے لیے وضع کیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اخلاق کی نقالی نہیں کی سکتی اور نہ ہی کوئی نظام اخلاق کسی قوم سے مصنوعی طور پر کچھ مدت کے لیے مستعار لیا جا سکتا ہے۔ اس کائنات کا ہر فرد یا کوئی گروہ جب کسی "راز" کو پا کر اُس کو پھیلانے کی کوشش کرتا ہے، تو اپنے اس نصب العین کے حصول کے لیے وہ اپنے آپ کو خود اپنی مرضی سے چند آئین و ضوابط کا پابند بناتا ہے۔ یہی دراصل اُس فرد یا گروہ کا اخلاق ہے۔ دنیا میں یہ کبھی نہیں ہوا کہ بغیر کسی قسم کے اوصاف اپنے اندر پیدا کیے کوئی شخص ایک قدم بھی بڑھ سکے۔ یہ ضروری نہیں کہ نصب العین صحیح ہو، مگر اُس کو حاصل کرنے کے طریقوں میں چند ایجابی صفات (positive) کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے۔ مثال کے طور پر اگر ڈاکوؤں کا ایک گروہ بھی ڈاکہ کی غرض سے نکلتا ہے تو اُس کی کامیابی کے لیے بھی چند صفات کا ہونا ازحد ضروری ہے۔ سب سے پہلے انہیں اپنے مقصد سے محبت ہو کیونکہ اس کے بغیر وہ قربانی نہیں کریں گے، دوسرے انہیں ایک دوسرے پر اعتماد ہو، تیسرے وہ سخت سے سخت مشکل کے وقت ہراساں نہ ہوں، چوتھے اپنے سردار کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ اگر غور کریں تو معلوم ہوگا

کہ مقصد کے ساتھ عشق نے اُن کے اندر یہ صفات پیدا کی ہیں۔ یہ مصنوعی طریق سے اُن کے اندر داخل نہیں کی گئیں۔

یہی حال مغرب کا ہے۔ اُن کا اپنا ایک زاویۂ حیات ہے، اُن کے سامنے ایک واضح مقصد اور نصب العین ہے اور اس کے ساتھ انہیں بے حد لگاؤ ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے وہ ہر آن مضطرب رہتے ہیں، اس کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ ظاہر بات ہے اپنی اس تگ و دو میں وہ چند آئین و ضوابط کی پابندی کرنے پر مجبور ہیں۔ اس معاملہ میں جس قدر اُن کا عشق زیادہ ہوگا اسی قدر اُن میں یہ صفات اُبھرتی چلی آئیں گی اور جس حد تک اس میں کمی ہوگی، اسی حد تک یہ صفات ماند پڑیں گی۔

یقین کیجیے، ملّتِ اسلامیہ آج بھی اگر اپنے نصب العین کے معاملے میں یکسو ہو کر اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کرے تو یہ ساری خوبیاں جنہیں بدقسمتی سے آپ صرف یورپین تہذیب کا خاصہ سمجھتے ہیں، اس کے اندر خود بخود پیدا ہو جائیں گی۔ یہ قوم اہلِ مغرب سے زیادہ وقت کی پابند ہوگی، اُس سے کہیں زیادہ ایفائے عہد کا اہتمام کرے گی اور اس سے بہت زیادہ اپنے آپ کو محنت اور مشقت کی عادی بنائے گی۔ پھر یہ صرف مغربی قوموں کی طرح اپنوں سے وفا نہیں کرے گی، بلکہ خدا اور آخرت پر ایمان لانے کے بعد اور اسلام کی ابدی اقدار کو ماننے کے بعد اس میں یہ صفت یہاں تک پیدا ہو جائے گی کہ اپنے خون کے پیاسوں، جان کے دشمنوں تک سے، اپنی زندگی کی بازی لگا کر بھی عہد کو پورا کرے۔ وہ کسی ملک یا بستی سے نکلنے سے پیشتر سب کچھ لوٹ گھسوٹ کر ساتھ لے جانے کی کوشش نہ کرے گی بلکہ اُس کے افراد دشمنوں کے نرغہ میں بھی سب سے زیادہ اس بات کے فکرمند ہونگے کہ کسی طرح لوگوں کی امانتیں اُن تک لوٹائی جائیں۔ مسلمان اپنے بلند ترین اخلاق کی لامثال روایات پہلے بھی قائم کر کے دکھا چکے ہیں۔ اس کے اخلاق کی کرم فرمائیاں وطنی اور ملکی حدود تک محدود نہ ہونگی بلکہ پوری نوع انسانی ان سے متاثر ہوگی۔ اخلاق کے معیار ایسے سیمابی نہ ہونگے جو گروہی و نسلی مفادات کے ساتھ ہر آن

تبدیل ہوتے رہیں بلکہ وہ تمام اقوام اور افراد کے لیے ایک ہونگے۔ اس کے علاوہ لوگ ان اخلاقی ضوابط کی کھلے ہوئے اور چھپے ہر حال میں پابندی کریںگے، کیونکہ ان کے اخلاق کا اصل محرک یہ احساس ہے کہ ایک علیم، خبیر اور بصیر ذات اُنہیں ہر حالت میں دیکھ رہی ہے، وہ اعمال تو کہاں نیتوں تک کو جانتی ہے، ارادوں تک سے پوری طرح واقف ہے۔

آخر میں یہ بات بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ یورپ کی جس ترقی پر آپ فریفتہ ہو رہے ہیں وہ دراصل ترقی نہیں بلکہ تنزل ہے۔ مشینوں، کلوں اور عمارات کی فراوانی کبھی ترقی کی ضمانت نہیں قرار دی جاسکتی۔ مگر اصل ترقی یہ ہے کہ انسانیت نے کہاں تک امن و سکون حاصل کیا ہے۔ اس معاملے میں مجھے شک ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ یورپ سخت ناکام رہا ہے۔

خریداران ترجمان القرآن سے التماس

۱۔ چندہ کے منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ صاف، خوشخط لکھیے (خصوصاً ڈاک خانہ اور ضلع کا نام انگریزی کے بڑے حروف میں درج کیجیے)۔ اور سابق نمبر خریداری بھی۔

۲۔ تبدیلیٔ پتہ کی فرمائش مہینہ کی ۱۵ تاریخ تک دفتر کو پہنچ جانی چاہیے جس میں پہلا اور نیا تبدیل شدہ پتہ دونوں نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ درج ہوں۔

۳۔ اجرائے رسالہ کے لیے پیشگی چندہ بھیجیے یا وی۔ پی کی اجازت دیجیے۔ قرض یا وعدہ پر رسالہ جاری نہیں کیا جاتا۔

اگر خدانخواستہ آپ ان گذارشات کو نظر انداز کریں گے تو دفتر کی مجبورانہ کوتاہیوں کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔

منیجر

مطبوعات

تاریخ اسلام حصہ اوّل و دوم | مصنف: مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔ ناشر نفیس اکیڈمی کراچی
قیمت فی حصہ ۱۲ روپے۔

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کی تاریخ اسلام اس سے پہلے صوفی پرنٹنگ پریس پنڈی بہاؤالدین سے ۱۳۴۳ھ شائع ہوئی تھی۔ اور خاصی مقبول بھی ہوئی۔ اب اکتوبر ۱۹۵۶ء میں محمد اقبال سلیم گاہندری نے اسے شائع کیا ہے۔ تاریخ کی ایسی کتابیں تجارتی فائدوں کے علاوہ محققین کے لیے بھی مفید ہوتی ہیں ان سے پورا پورا فائدہ اس وقت تک نہیں اٹھایا جا سکتا جب تک آخر میں اسماء الرجال اور اماکن کے اشاریے نہ ہوں۔ مولانا اکبر شاہ خاں کو ہندوستانی مورخوں میں خاصا مقام حاصل ہے۔ ان کی کتاب ضخامت اور محتاط نقطۂ نظر کی وجہ سے اس قابل تھی کہ اسے ایک REFERENCE BOOK کے طور پر شائع کیا جاتا۔ بلکہ اگر بعض مقامات پر فٹ نوٹوں میں توضیحی اشارے اور بعض مشکوک مقامات پر حواشی بھی شریک کر دیے جاتے تو کتاب عام پڑھنے والوں کے علاوہ محققین کے لیے بھی بڑی مفید ثابت ہوتی۔ موجودہ صورت میں بھی ڈیڑھ ہزار صفحے کی اس کتاب کا شائع ہو جانا قابلِ ستائش ہے۔ مرحوم اکبر شاہ خاں نجیب آبادی بجنور میں پیدا ہوئے۔ نجیب آباد کے مڈل سکول میں ٹیچر رہے کچھ مدت کے بعد پنجاب میں آئے اور مختلف ملازمتوں کے بعد دیال سنگھ کالج میں پروفیسر رہے کچھ عرصہ زمیندار کی ادارت بھی کی اور پھر اپنے وطن میں جا رہے۔ ۱۰ مئی ۱۹۳۸ء میں وفات پائی۔ اس وقت تک بہت سی تاریخی کتابیں لکھ چکے تھے جن میں تاریخِ اسلام، آئینہ حقیقت نما اسلامی سپاہیانہ زندگی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ بیسویں صدی کے اوائل کے دوسرے مورخوں کی طرح اکبر شاہ خاں صاحب بھی تاریخ کے ساتھ فلسفۂ تاریخ کے شیدائیوں میں تھے۔ حافظہ بلا کا رکھتے تھے۔ بایں ہمہ اپنے معاصرین کی طرح ماخذ کے مفصل حوالے دینے کے قائل نہ تھے جس سے عام قاری

تو فائدے میں رہتا ہے لیکن کتاب کی صحت اور عدم صحت کا جائزہ لینا خاصا دشوار ہو جاتا ہے۔ تاریخ اسلام کا جائزہ لیتے وقت مختلف فرقوں کے عقائد سے ٹکراؤ ناگزیر ہو جاتا ہے اس لیے اکبر شاہ خاں صاحب نے میانہ روی کو اختیار کیا ہے اور ایسی تفصیلات سے پرہیز کیا ہے جو بقول ان کے "نا اتفاقی پیدا کرنے یا جمعیت اسلامی کو نقصان پہنچانے کا موجب ہو سکے۔"

یہ ضروری نہیں ہے کہ سچائی ہمیشہ بین بین ہی واقع ہو۔ توازن قائم کرنے کی اس کوشش سے بعض جگہ مصنف کی تحریر میں تضاد بھی پیدا ہو گیا ہے۔ مثلاً خالد بن ولید کی معزولی کے سلسلے میں ایک طرف تو حضرت ابوبکر صدیق کو خالد بن ولید کا طرف دار بیان کیا گیا ہے اور ان کے بعض افعال کے محاسبے سے خلیفہ اول کا اجتناب ظاہر کیا گیا ہے اور دوسری جگہ حضرت عمرؓ کے حال میں خالد بن ولید کی معزولی کو منشائے صدیقی کے عین مطابق ظاہر کیا گیا ہے۔

فاضل مؤرخ نے اپنی کتاب کے مقدمے میں جن فلسفیانہ خیالات کا اظہار فرمایا ہے انہیں بھی پوری طرح کتاب کی تفصیلات میں درست ثابت نہیں کیا۔ خاص کر تاریخ اسلام کا اہم مسئلہ یعنی خلافت مولانا مرحوم کے لیے پریشانی کا سبب رہا ہے اور اسے وہ جرأت مندی کے ساتھ سلجھا نہیں سکے۔ وہ ایک طرف تو خلفائے راشدین کے دَور کو صحیح اسلامی دور سمجھتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی شخصی حکومتوں کو بھی سراپا خیر خیال کرتے ہیں۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں :-

> "وہ نظام حکومت جو اسلام قائم کرنا چاہتا ہے خلافت راشدہ میں اس کا نمونہ نظر آسکتا ہے۔ خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں کی حکومت کا نظام عام طور پر شخصی وراثتی سلطنت میں تبدیل ہو گیا لیکن تعلیم اسلام کی خوبیاں اور اسلامی اخلاق کے جلوے اکثر ملکوں اور اکثر خاندانوں کی حکومت میں نمایاں طور پر نظر آتے رہے اور مجموعی طور پر مسلمانوں نے جیسی حکومت کی ایسی اچھی اور قابل تعریف حکومت کسی دوسری قوم کو میسّر نہیں آئی۔"

یہ نقطۂ نظر خلفائے راشدین اور خلفائے بنو امیہ و بنی عباس کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتا ہے اب خلافت کے بارے میں مولانا کا نقطۂ نظر بھی ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں :-

"آنحضرت کے بعد کسی شخص کو خلیفہ بننا چاہیے تھا اس کا جواب صاف ہے کہ اس کو جو خلیفہ بن سکا یہ کہنا کہ جو خلیفہ بن گیا وہ خلیفہ بننے کا مستحق نہ تھا دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ خلیفہ خود خدائے تعالیٰ نہیں بناتا۔ یہ کہ خدا جس کو خلیفہ بنانا چاہتا تھا اس کو نہیں بنا سکا اور انسانی تدبیروں سے نعوذ باللہ خدائے تعالیٰ شکست کھا گیا۔ بس ان لوگوں کی حالت جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت پر معترض ہیں اس شخص سے بہت مشابہ ہے جو کسی جج کی عدالت سے منشا کے خلاف فیصلہ سن کر کچہری سے نکلتا اور باہر آکر جج کو برا بھلا کہتا ہے۔ . . . اسی طرح خدائے تعالیٰ نے اپنا فیصلہ خلافت کے متعلق صادر فرما دیا اور جس کو خلیفہ بنانا چاہا اس کو خلیفہ بنا دیا۔"

دوسری جگہ فرماتے ہیں :-

"شخصی و ذاتی سلطنت کی رسم بد جو خلافتِ راشدہ کے عہد مسعود میں مٹ چکی تھی مسلمانوں میں جاری ہو گئی اور اس رسم بد پر رضامند ہو جانے کا خمیازہ مسلمانوں کو بارہا بھگتنا پڑا۔ وراثت ولیعہدی کی نامعقول اور ناستودہ رسم نے بسا اوقات ایسے ایسے نالائق و ناہنجار لوگوں کو مسلمانوں کا حکمران بنایا جن کو معمولی بھلے آدمیوں کی مجلس میں بھی جگہ نہیں ملنی چاہیے تھی۔"

ان بیانات کا مقابلہ کیا جائے تو منطقی مغالطہ واضح ہو جاتا ہے جو دلیل خلیفۂ اول کے لیے استعمال کی گئی ہے اس کی رو سے ولید کی ولیعہدی بھی جائز قرار پاتی ہے۔ کیونکہ جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے تو پھر اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ دوسرے اقتدار [illegible] کیوں غلط قرار دے رہے ہیں جبکہ انہیں اس بات [illegible] ہے کہ مشیتِ ایزدی نے یہی چاہا اور قضا و قدر کے نوشتے پورے ہو کر رہے۔ دوسری جلد کے شروع میں بھی اسی خیال کا وہ اعادہ کرتے ہیں کہ ہمیں ایمان رکھنا چاہیے جو کچھ ہوا مشیتِ ایزدی کے ماتحت ہوا اور یہی ہونا چاہیے کیونکہ ہمارے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے کہ ہم وقوع یافتہ اعمال و افعال کے نتائج پر اپنی نابودہ اور غیر واقع شدہ تجاویز کے نتائج کو یقینی طور پر ترجیح دے سکیں۔

استدلال کا یہ طریق بڑا غلط اور غیر منطقی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے

وہ مشیتِ ایزدی سے ہی ہوتا ہے لیکن ہمیں اس بات کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ اسی خالق نے جس نے یہ کائنات پیدا کی ہے، اور جس کا حکم یہاں جاری و ساری ہے، اس نے انسانوں کو ایک محدود پیمانہ پر آزادی بھی دے رکھی ہے۔ اس دائرہ میں انسان اپنے اعمال کا مختار ہے اور اس کے متعلق اُس سے آخرت میں باز پُرس ہو گی۔ اگر اس بدیہی حقیقت کو تسلیم نہ کیا جائے تو حق و باطل کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔

تبصرہ نگار کے نزدیک تاریخ اسلامی کی ترتیب و تدوین میں جن دو چیزوں کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ہیں مؤرخانہ دیانتداری اور جرأت۔

اس کتاب کے متعلق مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا اکبر شاہ خاں کی تاریخ اردو زبان کی دوسری مکمل تاریخوں میں سب سے زیادہ مفید اور کارآمد ہے۔ ناشر کا اتنی ضخیم کتاب کا شائع کر دینا تاریخ اسلامی کی بڑی خدمت ہے لیکن ہم اسے توقع رکھتے ہیں کہ اگلے ایڈیشن میں وہ مصنف کی معمولی معمولی غلطیوں اور فروگزاشتوں کی تصحیح حواشی میں کر دے گا۔ اور اس طرح کتاب کو زیادہ مفید اور کارآمد بنا دیگا۔ کتاب کی کتابت اور طباعت کا معیار عمدہ ہے۔

معاشیات حصہ اوّل از پروفیسر خواجہ محمد اسلم صاحب صفحات ۲۷۲ قیمت ۵ روپے۔ ناشر: کارواں بک ڈپو، لاہور۔

اس دور میں معاشیات کو جو زیادہ اہمیت ہماری اجتماعی زندگی میں حاصل ہے وہ کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہر طبقۂ خیال کے لوگ اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہمارے ہاں معاشیات کا جو نصاب عرصہ سے رائج چلا آ رہا ہے وہ بڑا ناقص ہے اور ہمارے دور کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے اصولی اور عملی پہلوؤں کے درمیان ایک مغائرت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ثانوی تعلیم کے اربابِ بست و کشاد نے اس خامی کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے اصلاح نصاب کی طرف ایک عملی قدم اٹھایا۔ زیرِ تبصرہ کتاب اسی نئے سلیبس کے مطابق لکھی گئی ہے۔

کتاب کے مصنف پاکستان کے علمی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ تقریباً بائیس سال سے اسلامیہ کالج لاہور میں معاشیات و سیاسیات کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں اور اس وجہ سے

تعلیم و تعلم کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ یہ کتاب انھیں کی فکری کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ ان کا انداز بیان سادہ اور دلکش ہے۔ انھوں نے علم کی فنی پیچیدگیوں کو جس بخوبی سے حل کیا ہے وہ قابل داد ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کہیں کہیں بڑی بڑی عمدگی کے ساتھ معاشی مسائل میں اسلام کے نقطۂ نظر کی وضاحت فرمائی ہے۔ یہ کتاب اگرچہ انٹرمیڈیٹ کے طلباء کے لیے لکھی گئی ہے مگر اس سے تمام وہ لوگ استفادہ کر سکتے ہیں جو اس علم کے متعلق بنیادی معلومات حاصل کر کے اپنی استعداد کو بڑھانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کتاب کا معیار کتابت اور طباعت عمدہ ہے۔

اعلان:- ہمارے ایک رفیق جو ترجمان القرآن کے ایجنٹ تھے، بتقضائے ایزدی یکم نومبر کو فوت ہو چکے ہیں۔ (اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے) ان کے پاس ترجمان القرآن کے پرانے پرچے کافی تعداد میں موجود ہیں۔ اسوقت صورت حال یہ ہے کہ اُن کے ذمہ کافی رقم قابل ادائیگی ہے جس کے ادا کرنے کے لیے کوئی چیز نہیں اس لیے اگر یہ پرچے ہی فروخت ہو جائیں تو یہ اُن کی اور اُن کے ورثاء کی بہت بڑی مدد ہو گی۔ لہٰذا اگر آپ کو مندرجہ ذیل پرچوں کی ضرورت ہو تو نیچے لکھے ہوئے پتہ پر خط و کتابت کریں۔

۱- ستمبر ۱۹۵۲ء - ایک عدد ۱۰/	۳- اپریل ۵۴ء ۵ عدد = ۳-۲-۰	۵- اکتوبر ۵۵ء تین عدد = ۱۴/
۲- جون-جولائی " " = ۱۴/	۴- مئی ۵۴ء ۱۰ عدد = ۶-۴-۰	۶- نومبر " ایک عدد = ۱۰/
۳- دسمبر " " = ۱۰/	۵- جون " ۷ عدد = ۴-۶-۰	۱- جنوری ۵۶ء ایک عدد = ۱۰/
۱- جنوری ۵۳ء " = ۱۰/	۶- جولائی " ۴ عدد = ۲-۸	۲- فروری " ایک عدد = ۱۰/
۲- مارچ اپریل " دو عدد = ۱۴/	۱- فروری ۵۵ء ایک عدد = ۱۰/	۳- اپریل " ایک عدد = ۱۰/
۴- ستمبر " ایک عدد = ۱۰/	۲- جون " ایک عدد = ۱۰/	۴- مئی " ایک عدد = ۱۰/
۱- جنوری فروری ۵۴ء ۴ عدد = ۵-۰-۰	۳- اگست " ایک عدد = ۱۰/	۵- جون " ایک عدد = ۱۰/
۲- مارچ " ۶ عدد = ۳-۱۲	۴- ستمبر " ایک عدد = ۱۰/	۶- دسمبر " ایک عدد = ۱۰/

محمد بشیر احمد دفتر جماعت اسلامی شہر جہلم - بالمقابل ٹاؤن ہال جہلم

خـــالی صفحـــه